

تلخا بے شہرِ ی

حفیظ

نشانی

۱۰۰

۱۰۰

۱۰۰

۱۰۰

۱۰۰

۱۰۰

۱۰۰

نخائے شیریں

حَفِظَ



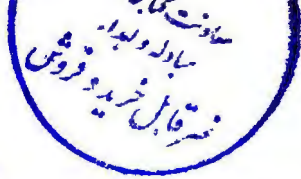
علامہ الدین مظہر ناناندہ خاص مصنف کے اہتمام سے

مفتوح پریس لاہور میں طبع ہوئی،

۱۲۰

ان تلخ آنسوؤں کو نہ یوں مُٹہ بنا کے پی
یہ مے ہے خود کشید اسے مُسکرا کے پی

حفیظ جالندھری کا تیسرا مجموعہ سخن



تلخابہ شیری

"نغمہ زار" و "سوز و ساز" کے بعد کی آواز

دیباچہ خود نوشت

ترتیب فر بہ اضافہ اشعارِ نادرہ کار



مجلس اُردو - کتاب خانہ حفیظ ○ ماڈل ٹاؤن، لاہور

محمد حنون بچی مصنف محفوظ

۱۹۵۹ء

قیمت فی نسخہ مجلد چھ روپے

بیت

طے کا پتہ

اپنے ہر مقامی تاجر کتب سے

سوالیہ : علامہ الدین مظہر

مجلس اُردو، کتب خانہ حفیظ، ٹائٹلنگ ڈپو، سرہن لال روڈ، لاہور

کتاب نہ طے کے بارے میں یا اور کوئی شکایت ہو تو لکھیے :

ابوالاثر حفیظ جالندھری - ۴۴ جی ماڈل ٹاؤن

لاہور

فہرس

بقلم خود دیباچہ حفیظ ۹
یہ اشاعت از علامہ الدین منظر ۲۶

غزل

۵۰	مجھ کو خدا نے کیا دیا	۲۹	پروردگار
۵۲	مے پیئے بنیائے ہوئے	۳۱	یاد نہ تم کو آکے
۵۴	کشتی کون ڈوتا ہے	۳۳	جوانی کے ترانے گارباہوں
۵۵	آخر تم کیا یاد کرو گے	۳۵	پایا گیب ہوں
۵۶	مجھے منظر نہیں	۳۷	نیت مری خواب نہیں
۵۸	جبر مرے اختیار کے	۳۸	مری نیت خواب ہے
۶۰	ذرا اپنے اللہ کو یاد رکھنا	۴۰	افسانہ بنا دے
۶۱	فریب کھائے جا	۴۲	جسے بت بنایا خدا ہو گیا
۶۲	جہان برادر خفا نہ ہو	۴۳	میری خزاں کیا بہار کیا
۶۴	بعد فنا کیا ہو گا	۴۴	آدمی آخر کار کیا کرے
۶۶	وہ جانبیں نہ جانیں	۴۶	یہ ہماری زبان ہے پیارے
۶۸	زمانہ سازی	۴۸	کھلتا جا مڑھتا جا

۷۶	اور جینا چاہتا ہوں	۷۰	چند اہل دل سمجھتے ہیں
۷۷	سجدہ نگاہ میں	۷۲	داستانِ گریہ اپنی
۷۸	مجھ کو مرے خدا سے پیشاں نہ کیجئے	۷۴	جو میں نے کبھی روزِ ناچا ہا
۸۰	خانہ خرابی		

رُتِ سنگیت

۸۳	تیری منزل دور
۹۷	مستعد ہمار
۱۰۱	درشن
۱۰۳	بستِ رُت
۱۰۷	گھر چھوٹا تماشا
۱۰۹	منتر

افرنک کی دُنیا

۱۱۳	اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے
۱۲۵	نیرنگِ فونک
۱۴۱	محض بہرِ مصحفہ

شکاری اور شکار

- ۱۴۵ شیروں کو آزادی ہے
۱۵۳ عزم آدم

دیوانہ بکار

- ۱۵۶ اب خوب ہنسنے لگا دیوانہ گرم جوشی
۱۶۳ اب خوب ہنسنے لگا دیوانہ سردہری
۱۶۸ تو کہہ جا رہا ہے دیوانے !

رومان و عرفان

- ۱۶۱ نغمہ تصویر
۱۶۴ نغمہ تجسس
۱۶۵ میری جوانی
۱۸۰ کیا ہوں میں
۱۸۱ میرا کلام بہترین
۱۸۶ بکوشید !
۱۸۷ میری شاعری

یاران تیز گام

۱۹۷

وفات کی بات

۱۹۹

آغا حشر

۲۰۳

سید راس مسعود

۲۰۶

اقبال، زندگی میں

۲۱۲

اقبال کی خبر مرگ

۲۱۳

اقبال کے مزار پر

۲۱۶

ہم سفر

تعمیر و تخریب

۲۱۹

بجاریہ پرست

۲۲۷

ایک مذہب شہر

تقدیر کشمیر

۲۳۱

تقدیر کشمیر

۲۵۷

خان کے چراغ

۲۶۲

لبیک

۲۶۳

غزور

۲۶۴

عجز

بہتلم خود ۱۹۴۷ء

کسی دوست کو تکلیف دینے کی بجائے میں نے اپنے ہی قلم سے دیا چے کے طور پر یہ سطور درج کتاب کرنا پسند کی ہیں۔ اس لیے کہ نثر میں دوسرا کوئی بھی یہ طرز تحریر اختیار نہ کرے گا، میرا کوئی دوست ہی سہی بقائم ہوش و حواس پریشان نگاری کا مرتکب کون ہو۔ پھر میں ایسا نادر و کمیاب موقع ہاتھ سے کیوں جانے دوں! یہ تمنا ہے جسے کہنے کو میں نے شیریں بھی کہ دیا ہے، میری چند ایسی غزلوں، گیتوں، تھوڑی سی "فیل" اور بہت سی طویل نظموں کا مجموعہ ہے جو میں نے نغمہ زار و سوز و ساز کی اشاعتوں کے بعد اپنی دوسری مصروفیات کے باعث لکھیں، مختلف رسائل میں شائع ہوئیں اور جن کو بے شمار مجالس فن و شعر میں لوگوں نے مجھ سے بھی سنا۔ مستقرات کی شیرازہ بندی کے لحاظ سے پہلے دونوں ایسے ہی مجھے سے "نغمہ زار" ۱۹۲۵ء میں اور "سوز و ساز" ۱۹۳۳ء میں پیش کیے گئے تھے۔ "یہ تمناہ شیریں" تیسرا ہے۔ اتنی مدت یعنی تیرہ برس کے بعد یہ چھڑاسا کتابچہ کوئی قابل قدر کارنامہ نہیں جس پر سنیہ تان کر فخر کیا جاسکے۔ "نغمہ زار" اور "سوز و ساز" بھی کوئی عظیم

”اینٹ البحر“ نہ تھیں۔

تاہم اُس وقت میرے لیے یہ کہنے کی گنجائش تھی کہ رسالہ ”مخزن“ کی ادارت کے ساتھ ساتھ میں نے ”شاہنامہ اسلام“ کی پہلی جلد لکھی خود ہی شائع بھی کی۔ خود شائع کرنا میرے لیے لکھنے سے زیادہ پُر معنی ہے۔ بچوں کے لیے بھی لکھتا رہا۔ نشر میں چند افسانے بھی مرتب کیے۔ پھر ”مخزن“ کی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو کر ”شاہنامہ اسلام“ کی دوسری جلد بھی مکمل کر ڈالی۔ مجموعہ ”سوز و ساز“ اس دوسری جلد کے ساتھ ایک ہی سنہ میں شائع ہوا تھا۔

لیکن ۳۳ء سے ۴۶ء تک تو ایک بڑا وقفہ ہے۔ اس عرصہ دراز میں ”شاہنامہ اسلام“ کی صرف تیسری جلد مکمل اور شائع ہو سکی۔ اب چوتھی جلد اس کتاب کے ساتھ ہی طباعت کے لیے مطبع میں جا رہی ہے چند صفحات کی دوہلی نظائیں ”پردہ اور تعلیم“ اور ”یہ ہماری انجمن“ چھاپی گئیں۔ یہ سنگامی اجتماعات کے لیے تھیں ایک لمبی اور مستقبلِ نظم ”تقدیر کشمیر“ بھی کتابی صورت میں نکلی۔ نیز بچوں کے لیے گیت اور نظائیں جمع کی گئیں ان میں سے بہت کچھ میں ۱۹۲۵ء تک لکھ چکا تھا۔ اب چند اور لکھی گئیں اور چار چھوٹے چھوٹے مجموعے مرتب اور شائع ہو گئے۔ خیر یہ ایک دوسرا موضوع ہے۔

کنا یہ ہے کہ یہ چھوٹی سی کتاب تیرہ برس کی کاوشوں کا انتخاب ہے۔ مجھ سے پہلے گزر جانے والے شعرائے متقدمین کا ذکر کیوں کیجیے کہ وہ تو تھے ہی بڑے اور عظیم۔ لہذا اُن کے دواوین اور کارناموں کو تو بحرِ وقار ہونا ہی چاہئے تھا، لیکن اس کا جواب کیا ہے کہ میرے ہم عصر جو اپنے گندم کو بھوسہ سے الگ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے، یا وہ ٹو دار و اِن سخن جو ”مجدد المیوں کو“ آپ تو ہمارے بزرگ ہیں“ کہنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں اُن کے خرمین و درضمن انباروں کے سامنے میری ان ننھی ننھی ڈھیریوں کی حیثیت کچھ بھی نہیں۔

مجھ سے مواخذہ ہوا ہے۔ ہونا بھی چاہیے۔ میرے کام کی قدر کرنے والے محاسبہ کر سکتے ہیں۔ کوئی کسی دوسرے کے سامنے جوابدہ نہ بھی ہو جب بھی مذمت کسی ماخوذ کرنے والے کی محتاج نہیں ہوتی۔ کیا اعتراف کے لیے لازمی طور پر اپنے سے الگ کسی ہستی کی ضرورت ہے؟ کیا آدمی خود اپنی ذات پر حکم نہیں لگا سکتا؟ سرِ مذمت اپنے سامنے بھی تو ٹھجک سکتا ہے!

میں خود اپنی ذات پر فردِ جرم عاید کر چکا ہوں۔ میں نے مراحلِ ادب میں وہ تیز رفتاری نہیں دکھائی جس کی مجھ سے توقع تھی۔ میں اپنی اختیار کردہ راہ کا سست گام راہِ رو ثابت ہوا ہوں! آج کیا کسی دور میں بھی "آرٹ" نے اپنے غلاموں کے تباہی کو گوارا نہیں کیا۔ تخلیقی سینیہ کاوی و ہمشرق ہے جو اپنے چاہنے والے اہل نظر کی پاک تک جھپکنا پسند نہیں کرتی، بقول غالب ۷

زندہ ہزار شیوہ را طاعتِ حق گراں نبود

لیک صغیر بہ سجدہ درنا صیہِ مشترک نہ خواست

تاہم اے میری محبوبہ، اے میری زندگی، اے حسینہ فن، جتنا جی چاہے مجھ پر خفا ہو لے، سزا دے لے۔ لیکن عتاب کر، حجاب نہ کر۔ مجھ سے چہرہ نہ چھپا۔ میں کام چور نہیں، محتاط ہو چکا ہوں، شاید ضرورت سے زیادہ محتاط۔۔۔۔۔!

میرا غدر یہ ہے کہ تیرے ہی جمالِ جاں آرا کی دیدِ مزید کے اشتیاق میں اپنی نگاہوں کو اور چلا دینے کے لیے سرِ میرہ میا کرتا رہا ہوں ۷

یہی تو چشمِ حقیقت نگہ کا سُدر ہے

نزاعِ کافرو دیندار دیکھتے جاؤ

جہاں بھی تھا، جس حال میں تھا، آنکھیں تجھی پر لگی تھیں۔ میری آوارگی غفلت نہ تھی، فرار و گریز نہ تھا۔
ہجرت تھی پلٹ آنے کے لیے۔۔۔!

دیکھ تو سہی تیرے ہی حرمِ ناز، تیرے ہی خانہِ باغ کی تزیین و آرائش کے لیے نوادرجع کر لایا ہوں۔ میسے
احساسات، میرے تجربات، پھولوں بھرے کانٹے۔۔۔!

اں میں ان ہی کے لیے سرگرداں رہا ہوں۔ شاہراہوں سے گزرتا ہوا، شاہراہوں سے دور دور۔
پگڈنڈیوں سے بھی دور۔۔۔

پگڈنڈیاں شاہراہوں سے جا ملتی ہیں اور شاہراہیں تیرے دربارِ عام کی سیڑھیں تک پہنچا تو دیتی
ہیں لیکن پلٹا بھی دیتی ہیں۔ آج کل ان پر بڑا هجوم ہے، آنے جانے والوں کا، آنے والے، جانے والے۔۔۔!
اور ان دونوں پر پھول بربانے والے، ڈھیلے پھینچنے والے بھی۔۔۔!

پلٹ کر جانے والے ہمت جوش میں ہیں۔ شور ہے، ہنگامہ ہے، ہر ایک دعویٰ دار ہے کہ اس نے
تیری اصل صورت دیکھی ہے۔ ہر ایک دعویٰ دار تیرے خدو و خال کا حال عالمانہ اندازِ تحکم سے بیان کرتا ہے۔
ان بیان کرنے والوں میں بڑا اختلاف ہے، مشاہدے کا اختلاف!

جھکڑتے ہیں، مونٹوں میں کھٹ بھر بھرتے ہیں۔ دست و گریباں ہوتے ہیں۔ ان کی عالمانہ
زبانوں سے ایسی ایسی آوازیں نکلتی ہیں جیسے سرک کوٹنے والے انجن۔ تو سنئے تو یقین نہ کرے کہ یہ تیری
گفتگو ہے، تیرا تذکرہ ہے!

غینکیں فروخت ہو رہی ہیں۔ وہ ویدہ و رجب تیری جلوہ گاہ کی طرف بڑھے چلے جا رہے ہیں۔
دھڑا دھڑا خرید رہے ہیں۔۔۔۔۔

رنگین رنگین عینکیں، دبیز شیشوں والی خوردبینیں، دُور بینیں بھی پک رہی ہیں۔ فوٹو گیرے بھی پک رہے ہیں۔ رنگا رنگ تصویروں کی بڑی مانگ ہے۔ اس بڑھتی ہوئی گرم بازاری نے تصویریں ارنال کر دی ہیں!

میں نے یہ تصویریں دیکھی ہیں اور جانتا پہچانتا ہوں جن کی یہ تصویریں ہیں۔ اے محبوبہ فن! ان تھوہین فن نے تیری نوکرائیوں کی جھلک دکھ لی ہے۔ کیا تجھے یاد نہیں، تیری کچھ پہرہ دارنیاں اور دربار عام کی سیڑھیں کو گرد و غبار سے پاک رکھنے والیاں تیرے محل سرا کی حوالی میں بیرونی صدر دروازے سے باہر بھی رہتی ہیں۔ یہ تیرے جمال جاں سوز سے مالا مال ہو کر پٹنے والے اہل نظر روایت فرماتے ہیں کہ تو بڑھی ہو گئی ہے۔ تیرے نقاب پر جھریاں پائی گئی ہیں اور تو کچھ نہیں ہے صرف روایتی غزل!

مجھے منہسی آجاتی ہے۔ رو بھی دیتا ہوں۔ مجھے ان پر رحم آتا ہے۔ غریب بیچارے تیری جلدہ گاہ تک نہ پہنچ سکے۔ تجھے دیکھ نہیں پائے، ان کو پٹنے کی جلد ہی تھی، جلس ان کا منظر تھا۔!

میں ان سے تعرض کیوں کروں۔ کہ چکا ہوں مجھے ان پر رحم آتا ہے۔ ہاں تجھ سے کہتا ہوں اے نازک مزاج! تیری شاہراہیں ان لٹنے جھکٹنے والوں کی لکد کوئی سے پامال ہو گئی ہیں۔ پگڈنڈیاں بھی شاہراہیں بنی جاتی ہیں۔

تجھے یاد ہو گا جب میں پہلے پہل تیری طلب میں چل نکلا تھا۔ کھیت کیسے سٹھانے تھے، میں ان کی مینڈوں پر سے گنگنا، ہوا گزرا۔ تیری وادیاں شہزادیاں تھیں اور کسار کا اچھوتا دامن بہار اندر بہار اور نکمت گل اندر گل۔!

تحقیق حُسن کی کٹھن گھاٹیاں، پتھروں پر میرا ڈگمگانا، مشکلات کی ابھری ہوئی چٹانیں، ان کی مھاڑیں

اور تیز نوکوں پر اپنی آنکھوں کو تول تول کر رکھنا کتنا بھلا تھا۔ میرا عزم مجھے ہر آن بلند کر رہا تھا اور میرے عزم کو بڑھانے والا کون تھا، تیرے جلوہٴ منتظر کے سوا۔

اپنے ہی چلن پر چلنے اور کامیابی کی پہلی چوٹی تک پہنچ جانے پر میری اولین مستی کے وہ گرم گرم آنسو جن کی نمکینی اب تک میرے لبوں پر ہے اور وہ عالمِ حبِ تو نے پہلے پہل نزولِ اجلال فرمایا تھا بعض میرا حوصلہ بڑھانے کے لیے مجھے اور آگے اور آگے چلانے کے لیے۔

مجھے یاد ہے تیرے ارشاد پر میں نے ٹپٹ کر اپنی نگاہ ان دادیوں پر ڈالی تھی جن سے ہوتا ہوتا میں آیا تھا۔ نیچے، دُور دُور تک تیرے حُسن کے پرتو سے مملو۔ کبھی ہوئی لپستیکوں کی بساط اور اس بساط پر ججے ہوئے مُہرے۔ ایک دوسری کو کاٹتی ہوئی ایک دوسری کے متوازی ہموار راہیں اور ان پر دوڑ دوڑ کر ریختے والے !

مجھے کیا خبر تھی۔ میرا اس طرح چلنا بھی پگڈنڈیاں بنائے گا اور میرے پیچھے پیچھے میرے نقوشِ قدم کو ٹانے کے لیے چلنے والوں کی گراں خرامی پھولوں کے ساتھ ساتھ اُن پتھروں کو اور اُن کانٹوں کو بھی کوٹ پیس ڈالے گی جن کی دھاروں اور نوکوں پر میرے تنہا لوں کی رنگینیاں نثار تھیں۔

مجھے ان سے شکایت کیوں ہو۔ ایک طرح سے ان کے حوصلے قابلِ داد ہیں۔ یہ آسانی چاہتے ہیں بے حد شہِ سفر !

لیکن ان کو چاہئے کہ ان راہوں کو پاکیزہ رکھیں۔ اے ملکہِ فن تجھے کچھ سیاست دکھانی پڑے گی۔ یہ نہیں اس لیے کہتا ہوں تاکہ تیرے مُکھ میں لبسے والوں کے دماغ پر انگڑ نہ ہو جائیں۔ نہایت بیماری پیدا کرتی ہے۔ اب میں بڑے ہیر بھیر کے بعد اپنی پُرانی روش پر ایک دوسری سے کٹتی ہوئی اور ایک دوسری کو

کاٹتی ہوئی راہوں سے گھٹتا، کتراتا اپنی نگاہ کی سیدھ پر تیرے خانہ باغ میں آگیا ہوں۔ اپنی سیرگاہوں کی چمنی کے لیے مجھے کام کرنے دے !

ہاں دیکھ ! میرے شباب کی رنگین اور سادہ کلیوں اور جوانی کے شاداب و رنگین پھولوں اور سدا بہار گل بوٹوں کی مہاریں دیکھنے کے ساتھ ساتھ میرے تازہ تازہ تجروں کے کانٹے بھی دیکھ، جن کو سمیٹ کر میں بڑی حفاظت سے لایا ہوں اور جن کے منہ میرے اپنے ہی سخن آرزو سے رنگین ہیں۔ دیکھ، میں ان سے بائیس بجائے دیتا ہوں، رنگین پھولوں اور معصوم کلیوں کی حفاظت کے لیے۔

اے روج زندگی ! اے ملکہ سخن ! تو نے خود ہی تو مجھے اپنے باغ کا مالی بننے کے لیے منتخب کیا تھا میں تجبی سے تو سکھا ہوں اور کون تھا میرا سلھانے والا —

آ، میں تیری مانگ سنار دوں۔ اگرچہ باہر تنقید کی آندھیاں زوروں پر ہیں لیکن اب تجھے سادگی اور خوشی کی ذلت سیک کرنے کے لیے باہر نکلنا ہے۔ ایوان پہلے سے لٹے پڑے ہیں۔ تجھے ان مقبروں سے پرے ان جھوٹوں تک جانا ہے۔ جن میں بسے والوں کے پاس دلوں کی آنکھیں موجود ہیں، جن پر عینیں نہیں لگائی جاتیں۔ چل ان دلوں پر اپنا پر تو ڈال۔ نگاہیں بنٹنے کا وقت آگیا ہے۔

خیر — تیرا ورش جھروکا بھی بند نہیں ہونا چاہیے۔ سیڑھیوں کے سامنے پھر ایک ہجوم ہے یہ لوگ بھی تیری دید کے متناقی ہیں جلوہ مستعار کے شیدائی، یہاں نقاب ڈالے رکھ، وہی لہریاں نقاب جس کو یہ بڑھاپے کا نشان جان کر بھاگتے ہیں — تیرا جلوہ بے حجاب ان کی عینوں پر گراں گزرے گا۔

میرا اولین مجموعہ "کلامِ نغمہ ناز" ۱۹۲۴ء میں کاتب کے ہاتھ سے نکلا اور ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا تھا۔

اس میں جو کچھ درج ہے۔ میری چوبیس برس کی اولین کشتِ حیات میں سے تیرہ چودہ برس کی محنت کا انتخاب ہے ایک ہی برس کی پیداوار نہیں۔ اسی طرح ”سوز و ساز“ ۳۳ء میں خلا سے نمودار نہ ہوا تھا۔

میں یہ فقرہ نہ لکھتا، لیکن مجھے شک ہے کہ عام مطالعہ کرنے والے ہی نہیں۔ تجزیہ اور تذکرہ فرمانے والے بھی کتاب پر درج شدہ سن طباعت سے اُدھر نظر ڈالنے کی زحمت گوارا نہیں فرماتے۔ حالانکہ خود ادبھی کا قول ہے کہ شاعر کو اس کے ماحل کے تاثرات سے الگ نہیں کرنا چاہیے۔

میں نے گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنا آغاز کیا تھا۔ میری عمر آج پھیالیس برس اور گیارہ مہینے ہیں میں ۱۴ جنوری ۱۹۰۰ء کو پنجاب کے ایک پُرانے قصبے جالندھر میں پیدا ہوا تھا۔ موجودہ صدی اور میں ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔! کوئی اور ہوتا تو اسی ایک بنا پر شاعری سے بھی بلند کوئی اور دعویٰ کر دیتا۔ یہ میرا احسان ہے کہ میں شاعر ہونے کا بھی دبی زبان سے ذکر کرتا ہوں! —

دبی زبان سے اس لیے نہیں کہ مجھے اپنے ہم عصروں کی چھری کٹاری سے بعد از انکسار بچ نکلنے کی تمنا یا توقع ہے۔ نہیں یہ بازو میرے دیکھے بھالے ہیں جو کچھ یہ کہہ سکتے تھے، کہہ چکے، کہہ چکے، اس سے زیادہ کی توقع ان کی سمیت اور توفیق پر سوز و غم ہوگا، الا یہ کہ وہی آموختہ پھر دھرا دیں جس کی گردان ہر خادم زبان اور ہر صاحبِ قلم کے بارے میں ان کے قلم اور زبان سے ہوتی رہی ہے۔

۱۹۲۲ء میں جب میں نے پہلے پہل روایتی اندازِ سخن سے ہٹ کر اپنے خاص انداز سے لکھنا شروع کیا تھا اسی وقت سے میرا ان سے سلجھتا ہے۔ اُس وقت میں ”تازہ واروانِ بساطِ ہوائے دل“ میں سے تھا۔ شعر و سخن کو بہت برس سمجھ کر آزار سے زباں شد کے یقین پر داخل ہوا تھا مجھے خبر نہ تھی کہ میاں جنگل کا قانون ہے۔

لیکن میاں مجھے ایسی مخلوق کی بھیڑ بھاڑ میں سے راہ نکالنی پڑی، جس کا شعور ابھی تک دبوچ لینے، ہٹا بونی کر

ڈالنے اور کھا جانے سے آگے نہیں بڑھا۔ باغِ ادب ان کی شہکار نگاہ ہے۔ مجھے ان کے اکٹے وکٹے سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ ٹولیاں بھی مجھ پر لکیں، جھپٹیں۔

پہلے پہل یہ گیدڑ بھکی دیتے ہیں۔ کوئی سہم جائے یا الجھ پڑے تو ہجوم کرتے ہیں۔ ان سے بچنے کے لیے صرف ایک ہتھیار درکار ہے، بے پروا مسکراہٹ !

ان کو قتل کرنے میں وقت ضائع نہ کرنا چاہیے۔ یہ خود ایک دوسرے کے قاتل ہیں، بس۔ جس کو مسکا دینے کی توفیق ہو، اس سے یہ دور بھاگتے ہیں، غراتے ہوئے لیٹ لیٹ کر دانت دکھاتے ہوئے۔

ان کے سامنے چکار کی بڑی بھی نہ چھینکی چاہیے۔ اس طرح یہ ایک دوسرے ہی پر پل پڑتے ہیں اور یہ منظر کچھ ایسا خوشگوار نہیں ہوتا۔ ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھی سے خائف ہے۔ نہ جانے کس وقت بھنبھوڑ ڈالے۔

ان کی باہمی گروہ بندی، دائمی نفاق کے لیے۔ ان کا مل بیٹھنا ہمیشہ کے لیے جدا ہونے کی تمہید۔ ان کی خوش وقتی منافقت اور منافقت !

اے راہی ادب، اے مسافرِ شعر و سخن، اگر تیرے پاس بے پروا مسکراہٹ کا زبردست عصا نہیں تو اس باغ میں داخل نہ ہونا۔ اس جنگل سے نہ گزرنا۔

نہیں غائب زمانہ خطاب کے قابل
ترا جواب یہی ہے کہ مسکراتے جا

میں نے ”۱۹ء میں اپنے ارادے سے شعر کہنا شروع کیا تھا۔ غزل۔ کیر نکہ بھی سکد راج الوقت مجھ

یہک پہنچا تھا اور ابتدا میں مشق کے لیے تھا بھی مناسب اور آسان۔ لیکن انتہا میں دیکھا تو یہی غزل سخن کی دشوار ترین صنف پائی۔

میرے کتبے میں دور دور تک شوقِ علم تھا نہ ذوقِ ادب —! شاعری ورثہ میں نہیں ملی —
لاگ نہیں لگی۔ بیماری بڑا پر سوار آئی۔ مجھے اُس نے آیا —!

بچپن میں عام رسم و رسوم کے جنگامے، میلے ٹھیلے اور ان کے ساتھ ساتھ مذہبی غلو اور محبتِ مباحثوں کے نظارے، لڑکپن میں جنگِ عالمگیر اور اُس کی ہولناکیوں کی آوازیں اور ان کے تاثراتِ عنفوانِ شباب کے ولولوں سے گھٹتے ہوئے۔ اس جنگ کے بعد ہندوستان میں رُوحِ آزادی کا عمل اور ردِ عمل۔ ترکی اور خلافت کے لیے عام اضطرابِ وطن اور آزادی، شہنشاہی اور تنظیم، یہ سب کچھ اور ایسا ہی بہت کچھ۔ میرے دماغ پر مبہم مگر میرے قلب کی گہرائیوں میں واضح اثر چھوڑتے ہوئے گزرے۔ ان بیجوں کو اپنے وقت پر اُگنا تھا، زمین اور وقت کی آب و ہوا سے غذا لیتے ہوئے۔

میرے گھرانے پر موتِ وار دھتی اور میری جان پر نزولِ غم۔ میرے بھائیوں کو پلٹیک، ہیضہ لیے جا رہے تھے اور مجھے قافیے اور نبیت۔ زندگی میرے سر پر ہر قدم تازہ ذمہ داریوں کا پہاڑ لادتی اور شاعری مجھے ہانکتی تھی۔

اے مضمحل ایک تصویر اس طرح کی کھینچ دے
بار و بیش بسی کسی کوہِ گرانِ زندگی

انہیں دنوں ایک مردِ باصفا، ایک شاعر، صمیم معنوں میں شاعر، یعنی ایک انسان، فرشتہ رحمت کی طرح نازل ہوا۔ یہ گرامی تھا، روایات و رسوم کی پابندی کے لیے میں اس کے حنفیہ گیا۔ اس نے میرے سر پر

ہاتھ رکھا۔ فرمایا: ”اے میری خاکِ وطن کے ذرے، تقلید سے درگزر، وہ زمانہ لہ گیا! خاکِ صحرا ہونے سے کیا حاصل
 ذرہ نقاب اتار سکے تو آفتاب بن جاتا ہے۔“

شاگرزی، رنگ، پیروی اور تقلید اُن کے لیے رہنے دے جن کے پاس اپنی ذات نہیں۔ تو اپنی ہی روح
 کو اپنے قالب سے باہر نکال۔ اپنا ہی سینہ چیر ڈال، دل اُبل پڑے گا۔ جگنوؤں کے پیچھے نہ دوڑ خود روشنی بن اپنی
 آنکھوں کے لیے بھی اور جن کو روشنی کی ضرورت ہے، اُن کے لیے بھی!

”صاحبِ نظر کی ایک نگاہ کافی ہوتی ہے۔ یہ قول کسی روایتی غزل کے شعر میں تھا۔ روایتی شاعر کا یہ قول
 میرے لیے صداقت کا سرچشمہ بن گیا۔ میں نے اسی وقت سے اپنا مقصدِ حیات شعر و ادب کو قرار دے لیا اور
 مصمم ارادے کے ساتھ وہ تمام راہیں بند کر دیں، جو نگاہ و دل میں حائل تھیں۔“

ان دنوں میرا خیال تھا کہ روایتی ہو یا واقعی۔ شاعر وہ ہوتا ہے جس کا دل نرم، روح گرم ہو۔ دل آزادی
 جس کی سرشت میں نہ ہو۔ جس کا ظاہر و باطن ایک ہو کسی سے بھی کینہ و حسد نہ رکھے۔ جس کو فطرت کی طرف سے
 نیک نفسی و معیت ہو جن اور صداقت جس کا نصب العین ہو۔ خدا کی مخلوق کا بھی خواہ ہو۔ سب سے محبت
 کرے۔ سب کا بھلا چاہے۔ گرے ہوؤں، مظلوموں، ستم رسیدوں کے لیے اس کا قلم سہارا بنے۔ زیر و ستون کو
 اس کے شعر کی روح قوی کرے اور سوسے ہوؤں کو بیدار۔ ظالم اور زبردست اس کی آواز سے لرزیں اور
 پست ہو جائیں۔ اس کے نعرہ قلندرانہ کی آواز میں ذاتی غرض، ذاتی کینہ و حسد کا دخل نہ ہو۔

یہ اور اسی قسم کے دوسرے خیالات ہر شاعر کے متبلن گراہی کی دیدِ حالی کی شفیق، اقبال اور شیخ سعدی بقادر
 کی زندہ مثال نے میرے دماغ میں بھر دیے تھے۔ مجھے یقینِ کامل تھا کہ میں ایسی خاص الخاص برادری میں شامل
 ہو گیا ہوں، جس کا ہر فرد پکی نطف و اخلاص ہوگا۔ اور کیمیں نہ ہو مادامی سر بلندی کی تمام انگلیوں و نیوی جاہ و ثروت

کی تمام خواہشوں کو سچ کر شاعر خدمتِ فن ہی کو اڑھنا بچھڑنا بنا تا ہے، وہ مشہور ہو جائے یا غیر معروف رہے کامیاب ہو یا ناکام۔ اپنے ارادے اور اپنے فن کی وجہ سے دنیا بھر کا محسن ہے۔ اس کی سیدہ کاوی اور دل فکاری نور سحر اور رنگِ شفق کی مانند کائناتِ حیات پر بیداری اور نشاط و انبساط کی تجلیاں برساتی ہے لہذا مجھے سخنِ دروں اور سخنِ سخنوں سے اس شرف کی توقع نہ ہوتی تو کس سے ہوتی۔ لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ، میرے ماحول نے ان طفلانہ خیالات کی تائید نہ کی۔ یہ دور جس سے میں گزرا اور ہم سب گزرے ہیں اس کا خمیر ہی شاید نفاق اور تکدر سے ہوا ہے۔ میں نے لطف و اخلاص دیکھے۔ مگر بہت کم، الشاذ کالمعدوم —!

کمانیوں میں وہ تنہا شرف جو شاعر کا طرۂ امتیاز تسلیم کیا گیا ہے، خود کمانی بن کر رہ گیا ہے اور جن بزرگوں نے اپنی تحریر و تقریر سے یہ توقعات میرے دل میں جاگزیں کیں اور چلتے بنے۔ یہ روشنی اپنے ساتھ ہی لے گئے۔ ممکن ہے اب احساسِ ان نوجوانوں کی وجہ سے ظہور میں آئے جن کو مادرِ زندگی نے دردِ اجتماعی کے نئے سانچوں میں ڈھالا اور اخوتِ انسانی کے ماحول میں پالا ہے۔ شاید صدق و یقین کو ان کا قلم پھر روئے فن پر چمدا کرے۔ بشرطیکہ یہ نوجوان میرے زمانے والوں کے سایہ سے بچ سکیں —!

پُرانی تہذیب اور پرانی صدی کے باقیاتِ صالحات میں وہ کہنے سال بزرگ جن کو اگلے وقتوں کے کہ کر مٹایا اور شرابا جا رہا ہے، ان کی بات کون سنے، وہ چراغِ سحری ہیں۔

میں گوشہ نشین نہیں ہوں۔ مجھے اپنے عصر کے سخنوروں سے شرفِ ملاقات کے مواقعِ بخت اور اتفاق نے سب سے زیادہ اور بار بار ہم پہنچائے ہیں۔ نامی ناموروں سے نیاز حاصل رہا ہے اور ان سے بھی واقف ہوں جو نام اور ناموری کے لیے تحسینِ باہمی کے جھگڑے بنا کر لمبے لمبے ڈگ بٹھاتے اسی ڈھرتے پر

چلے جا رہے ہیں۔ اسی ایک منزل کی طرف جہاں ایک دوسرے سے نفرت، ایک دوسرے کا قتل مقصد زندگی سمجھ لیا گیا ہے۔

ایک طرف سیاست، زمانہ کی تلاؤں زبان، اردو اور اس میں جو کچھ ہے سب کا گلا کاٹ رہی ہے۔ دوسری طرف اسی زبان کے سب سے بڑے دعویدار اور محافظ ایک دوسرے کی گردن مار رہے ہیں۔ یہ ہے ماحول میرے وقت کی اردو شاعری کا۔

فلک بے مہر و عالم دشمن و محبوق بے پروا

مرا برآرزو بائے نظم سیری خندہ می آید

کون کتا ہے فکر و تخیل ان میں موجود نہیں، چاہیں، ارادہ کر لیں۔ ذرا سی محنت برداشت کریں، ذرا سا اخلاص اپنی ہی محنت کے لیے ربتیں تو اپنے کردار و گفتار سے اپنے وطن اور اس میں بسنے والوں کے لیے صبح امید بن سکتے ہیں۔ فن شعر کے دعویدار تھوڑے سے نہیں ہیں۔ دھاڑے کا دھاڑا ہے۔ ہر جگہ، ہر موڑ، ہر نکتہ پر —!

ملک میں سیاسی شعور کے ساتھ ساتھ شعری ضرورت اور اہمیت بڑھ گئی ہے۔ آج ملک بہت سے ٹکڑوں، حالی، بہت سے اقبال ڈھونڈتا ہے۔ اب شعر و شاعری چند خاص الخاص محفلوں میں ایک دوسرے کو سنا دینے اور واہ وائے لینے تک محدود نہیں رہی۔ آج شاعر محض کتاب میں نہیں۔ بے نفس، نفیس، عام خاص کے اجتماع میں مطلوب ہے۔ نئے نئے اجتماعی سوالات اور حمات کے حل میں تعاون کے لیے شہر و شہروں لوگ اپنے وقت کے شاعر دل اپنے زمانے کے سخنوروں کو دعوت دیتے ہیں۔ آنکھوں پر سٹھاتے ہیں — مریخ بلیک کی پالی دیکھنے کے لیے نہیں۔ زندگی تازہ، حیات نو کا نغمہ بیدار ان کی زبانوں سے سُسنے کے لیے۔

گفتار کی جھلک کردار میں دیکھ کر ان کی راہوں پر چلنے کے لیے تاکہ خواب بیداری کی تعبیر ہو سکے۔
 پوچھو، ان مزیدانوں سے اپنے شاعروں کے افسانے، دیکھو ان کی شرمناک بے باک نگاہیں، سُندان
 کی واہی تباہی —

انفرادی عیب سے کون خالی ہے لیکن اپنے عیب کی نمائش، اپنی کمزوریوں کی تبلیغ اور اس
 فخر و ناز کے ساتھ — !

کیا شاعر کے لیے بھیڑ یا سہنا ضروری ہے؟ یہ ایک سوال ہے جو شاعروں کو مدعو کرنے والے
 پوچھتے ہیں۔ اس دور کے عوام کیا خواص بھی یہ سمجھنے لگے ہیں کہ شاعر لازماً بد اخلاق ہوتا ہے۔ حتیٰ الوسع اس
 کے سایے سے بچنا چاہیے۔ آزاد خیال شرفا بھی اپنی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں اور بیویوں کو ان کی موجودگی
 میں پردے کی تاکید کرتے پائے گئے ہیں۔

اب کون دبی زبان سے بھی اپنے آپ کو شاعر کہہ سکے گا۔

جہاں تک شعر و شاعری کا تعلق ہے، یہ ہے ناقابلِ رشک ماحول اور یہ ہے ناگفتہ بہ دور
 کم و بیش اسی میں رہ کر نغمہ زار، سوز و ساز، مرتب ہوئیں۔ شاہنامہ اسلام لکھنے کا خیال و احساس پیدا ہوا
 جس کی چار جلدیں شائع کی گئیں باقی زیرِ تکمیل ہیں اور آج یہ تقاضا شیریں پیش کیا جا رہا ہے۔
 کیسے کموں میں نے یا میری شاعری نے ماحول سے اثر نہیں لیا۔ لیکن نغمہ زار کا دور لو کہیں سے
 عصفراں شباب تک کا زمانہ تھا۔ سلسلہ مشت اور اظہار ان تاثرات احساسات کا تھا جس کی ہر بات انوکھی

سانی اور خوشگوار تھی۔ خوشی حاصل ہو جانے پر خوشی، رنج و غم سے دوچار ہونے پر رنج و غم، مسکراہٹ، آنسو، کبھی طلب و تلاش، کبھی بے نیازی اور استغنا، انسانیت، غمِ عشق کی جستجو، فکر و روزگار سے گریز، ساتھ ہی زندگی کی اخلاقی ذمہ داریاں نبھانے کے لیے یہ نالہ — کہ

فصحت ہی نہیں دیتے افکارِ معیشت کے

بے فکری، خود نظری، لطافت، نزاکت، رقص، آئینہ، باغ و بہار، کُسمار، ٹھنڈی ہوائیں کالی گھٹائیں، سببلیاں، رُفغیں، رُخسار، تنائے دید، سب ذاتی انفرادی خود فرمیاں، ”ابھی تو میں جوان ہوں“ کا جلوس، غزلیں، حادثات کے خلاف غم و اندوہ کی ڈھالیں، آرزوؤں، اُمنگوں، تنائوں اور ترنگوں کے افسانے۔ اپنی زبانی جوانی کی کہانی، سارِ حیات پر محبت کے نغمے۔ ماحول کے روایتی پن کے سبب کچھ بے محل زیادہ بر محل، کچھ مفید، کچھ غیر مفید، مبہم مبہم، واضح واضح، شعور و امتیاز اور لاشعوری کا درمیانی برزخ۔ یہ تھا نغمہ زار —

”سوز و ساز“ کے ڈانڈے بھی اسی سے ملتے جلتے۔ یہاں جیسے گرد و پیش کے دُھندلے پن سے یکساں ایک شعلہ بھڑکے۔ پردے اٹھ جائیں، ہر منظر پیش نظر ہو۔ زشت بھی خوب بھی۔ ایک خوشگوار یقین، کسی بات کو جاننے پہچاننے کا۔ پالینے اور سمجھ لینے کا۔ اپنی نگاہ پر اعتماد، اپنی قوتِ اظہار پر اطمینان، رگوں میں حرکت حیات اس خیال سے تیز کہ دنیا اپنی ہے۔ سب کچھ اپنا ہے، سمیٹ لو غم بھی، خوشی بھی۔

نظر اور ذوقِ نظر دینے والے

عجب شے بنا دی ہے دُنیا نے فانی

لیکن ”یہ تمامہ شیریں“ کیفیات میں ”غیر زار“ اور ”سوز و ساز“ دونوں سے الگ ہے۔ اس میں انفرادی اور نظری انانیت کا نشہ اتر چکا ہے۔ ایک زالی دھن، تازہ مضروب، وہ منزل درپیش ہے۔ وہ بیج اُگے اور بار آور ہو گئے ہیں جو ابتدائی ماحول نے بوتے۔ تجربے نے جن کو ہوا و غذا پہنچائی۔

۱۹۳۲ء کے بعد کا ہندوستان اس میں بسنے والے ہم قدم اور سب بڑے چھوٹے اب وہ نہیں جو پہلے تھے۔ ملکی سیاسیات اور معاشیات کے عام اور معمولی مدو جزو کا دور گزر چکا۔ تلام و طوفان کا زمانہ ہے۔

فرد کی انفرادیت اگرچہ ختم نہیں ہو گئی لیکن اجتماعیت کا زندہ و بیدار اور خوشگوار شعور پیدا و پنہاں ہم آغوش کے لیے چاروں طرف باز و پھیلا رہا ہے۔ اب حسن و عشق سے زیادہ ٹھٹھاکا حادثہ، زیادہ ٹھٹھاکا کشمکش، ہر قدم پر ہر لحظہ رونا ہے۔

جہاں قسط سالی شد اندر دمشق

کہ یاراں فراموش کردند عشق

سارے جہان میں جماعتی احساس کی جو آگ بھڑکی اور بھڑک رہی ہے۔ ہم تک اس کی گرمی ہی نہیں شعلے اور لپٹیں پہنچ گئی ہیں۔ دوسری جنگ عالمگیر کی بھٹی نے بالواسطہ ہی سہی یہاں بھی کار فرمائی کی ہے یہاں بھی اجارہ داری اور مختاری کی زنجیریں پھیلنے لگی ہیں۔ محکوم و مجبور، کسان و مزدور، قوت سرمایہ اور سامان کے مقابل اپنی فاقہ زدہ ہڈیوں کو آراستہ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ نئی آرزوئیں جو پوری ہو کر رہیں گی۔ نئے جماعتی احساس بیداری کا شعور کہیں رفتہ رفتہ کہیں برسرِ صحت حسبِ حالات دلوں کی

پہنائیوں تک پہنچ رہا ہے۔ زندگی بن کر اُبھر رہا ہے۔ یہ نئی زندگی کہیں برسرِ کار ہے کہیں برسرِ نپکار۔
 اس کے مقابل بھی وہ سب کچھ ہو رہا ہے اور ہو گا جو دوسرے ملکوں میں انہی حالات کے اندر ہو
 چکا ہے، لیکن جد و جد کی بار بار ناکامی اور نامرادی اب پیچھے ہٹنے کی تلقین نہیں کرتی۔ زندگی آگے بڑھنے
 میں ہے۔ رہنا جو آگے بڑھا رہے تھے، پیچھے رہے جاتے ہیں۔ رہنماؤں کی اپنی اپنی منزلیں ہیں
 رہنما خیر ان ہیں کہ زندگی کی منزل اور آگے اور آگے کیوں ہے۔ یہ بزرگ بے بال و پری کی ایسی اڑان دیکھنے
 کے متوقع نہ تھے۔ اب بے بال و پری ان کے رو کے نہیں رکتی۔ ان کو معلوم نہ تھا کہ احساسِ حیات
 مادہ خود ہی بال و پری ہے۔ یہ احساس، یہ یقین اب جذباتی اور خیالی نہیں حقیقی اور واقعاتی ہے، انفرادی
 نہیں اجتماعی۔

”تلخا بہ شیریں“ اس زندگی تازہ سے خالی نہیں۔ چھوٹی چھوٹی غزلیں بھی ہیں، لمبی لمبی نظمیں بھی۔ ہلکے پھلکے
 گیت بھی۔ شاید سب میں اپنے وقت کے میسوں کا رس ہے۔ میرے تجربوں کی ملکی تلخی، لیے ہوئے شیریں۔

حفیظ

۷ دسمبر ۱۹۴۶ء

یہ اشاعت

میں نے اس نئی اشاعت کے لیے تحفیظ چچا کو مجبور کیا ہے کہ پرانی ترتیب میں اصلاح فرما دیں۔ نیز میری گزارش پر چند ایسی نظمیں بھی درج کتاب کر دینا منظور فرمائی گئی ہیں جو اس دور میں شعور شاعر کے اہم فیصلے اور حرب آخر معلوم ہوتی ہیں اور جن کو مصنف نے اس وقت درج کتاب کرنے سے احتراز کیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تحفیظ نے ترقی پسندی کے شور و غل کے پیش نظر ان تخلیقات کا گلا گھونٹ دینا چاہا تھا۔ وہ شرماتے تھے کہ کہیں اس گمراہی کی راہنمائی کا الزام ان پر نہ آجائے۔

میں نے جو چند نظمیں اس اشاعت میں درج کر دی ہیں۔ ان کو دیکھ کر اندازہ ہو جائے گا کہ ترقی پسندوں کی گمراہی کی ذمہ داری رہنما پر نہیں ہے — ان نظموں کے عنوان حسب ذیل ہیں :

منتر ، محض بہرِ مصحفہ ، نفوذِ تکبیر ، کیا ہوں میں ؟ ، بکوشید اور
ایک مذبذب شہر

علامہ الدین مظہر

غزل اُس نے چھڑی مجھے ساز دینا
 ذرا عسِ رفتہ کو آواز دینا
 صفی

کارِ مغال یہ قند کا شربت بیچنے والے کیا جانیں
 تلخی و مستی بھی ہے غزل میں خالی رس کی بات نہیں

پروردگارا

تو ہی بھروسا تو ہی سہارا
 پروردگارا — پروردگارا
 منظور منظور اے اہل دنیا
 اللہ میرا، باقی تمہارا
 یوں میں نے جیتی الفت کی بازی
 اک بار کھیلا، سو بار ہارا
 حاضر ہوں میں بھی، حاضر ہے دل بھی
 دل بھی تمہارا، میں بھی تمہارا
 یہ ناحدا ہے اے اہل کشتی!
 شاید کبھی وقت کر لے کنارا

سیراب کر دے دُنیا میں ساقی
عُقبیٰ کی تلخی مجھ کو گوارا

رُوئے فلک پر چھپائی سفیدی
چمکا ہے شاید میرا ستارا
آنکھوں میں آنسو، لب پر تبسم
اُن کا تصور، اپنا فطرا

جینا پڑے گا اے جان شیریں
کرنا پڑے گی تلخی گوارا
مٹی کے پتلے کیا چاہتا ہے
بختِ سکندر یا تختِ دارا
عفو و خطا میں صند ہو گئی تھی

وہ بھی نہ ہمارے میں بھی نہ ہمارا

پھر یہ جسم کس کے لئے ہے
آمرزگارا — آمرزگارا

یاد نہ تم کو آسکے

ہم ہی میں بھئی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آسکے
 تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ تمہیں بھلا سکے
 تم ہی نہ سن سکے اگر قصہ غم سنے گا کون
 کس کی زبان کھلے گی پھر غم نہ اگڑنا سکے
 ہوش میں آچکے تھے ہم، جوش میں آچکے تھے ہم
 بزم کا رنگ دیکھ کر نہ مگر اٹھا سکے
 رونق بزم بن گئے لب پہ حکایتیں رہیں
 دل میں شکایتیں رہیں لب نہ مگر ہلا سکے

شوقِ وصال ہے یہاں لب پہ سوال ہے یہاں
 کس کی مجال ہے یہاں، ہم سے نظر ملا سکے
 ایسا ہو کوئی نامہ بر، بات پہ کان دھر سکے
 سن کے یقین کر سکے جا کے نہیں سنا سکے
 عجز سے اور بڑھ گئی برہمی مزاجِ دوست
 اب وہ کرے علاجِ دوست جس کی سمجھ میں آ سکے

اہل زباں تو ہیں بہت، کوئی نہیں ہے اہلِ دل
 کون تری طرحِ خفیظِ درد کے گیت گا سکے

جوانی کے ترانے گارہا ہوں

جوانی کے ترانے گارہا ہوں
 وہی چنگاریاں سُلگا رہا ہوں
 ہری بزمِ وفا سے جانے والو
 ٹھہر جاؤ کہ میں بھی آ رہا ہوں
 بُتوں کو قول دیتا ہوں وفا کا
 قسم اپنے خدا کی کھا رہا ہوں
 وفا کا لازمی ہوتا یہ نتیجہ ،
 سزا اپنے یکے کی پا رہا ہوں
 خدا لگتی کہو بُت خانے والو
 تمہارے ساتھ میں کیا رہا ہوں

زہے وہ گوشہ راحت کہ جس میں
 ہجوم رنج لے کر جا رہا ہوں
 چراغِ حنائی درویش ہوں میں
 ادھر جلتا ادھر بجھتا رہا ہوں
 نئے کبے کی بنیادوں سے پوچھو
 پرانے بتکے کیوں ڈھا رہا ہوں
 نہیں کانٹے بھی کیا اُجڑے چمن میں
 کوئی روکے مجھے میں جا رہا ہوں
 ہوئی جاتی ہے کیوں بے تاب منزل
 مسلسل چل رہا ہوں، آ رہا ہوں

حفیظ اپنے پرانے بن سہے ہیں
 کہ میں دل کو زباں پر لا رہا ہوں

پایا گیا ہوں

جاں قطرے کو ترسایا گیا ہوں
 وہیں ڈوبا ہوا پایا گیا ہوں
 بہ حال گسری پایا گیا ہوں
 حرم سے دیر میں لایا گیا ہوں
 بلا کافی نہ تھی اک زندگی کی
 دوبارہ یاد نہ پایا گیا ہوں
 برنگِ لالہ دیرانہ بے کار
 بھلایا اور مہربان پایا گیا ہوں
 اگرچہ ابر کو ہر بار ہوں میں
 مگر آنکھوں سے برسایا گیا ہوں

پُردِ خاک ہی کرنا ہے مجھ کو
 تو پھر کا ہے کو نہلایا گیا ہوں
 فشتے کو نہ میں شیطان سمجھا
 نتیجہ یہ کہ بہکایا گیا ہوں
 کوئی صنعت نہیں مجھ میں تو پھر کیوں
 نمائش گاہ میں لایا گیا ہوں
 بقول بہمن قمرِ حُدا ہوں
 بتوں کے حُسن پر ڈھایا گیا ہوں
 مجھے تو اس خبر نے کھو دیا ہے
 سنا ہے میں کہیں پایا گیا ہوں
 حنیظ اہل زباں کب مانتے تھے
 بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

نیت مری خراب نہیں

برے مذاقِ سخن کو سخن کی تاب نہیں
 اگر وہ فتنہ کوئی فتنہ شباب نہیں
 نہیں ثواب کی پابند بندگی میری
 مجھے ذلیل نہ کر عذرِ کن ترانی سے
 جو کامیاب محبت ہر سامنے آئے
 قفس میں زمرہ سپید اسے رُوحِ آزادی
 اُسی کی شرم ہے میری نگاہ کا پردہ
 فنا ہے میں نے بھی ذکرِ بہشت و حور و طہور
 سخنورانِ وطن سب ہیں آفتابِ کمال
 سخن ہے نالہ دلِ نغمہ رباب نہیں
 تو حشر میرے لئے وجہِ خطر اب نہیں
 یہ اک نشہ ہے جو آلودہ شراب نہیں
 یہ اہلِ ذوق کی توہین ہے، جواب نہیں
 میں کامیاب نہیں ہاں میں کامیاب نہیں
 صدائے مرغِ نفس ہے نفیرِ خواب نہیں
 وہ بے حجاب سہی میں تو بے حجاب نہیں
 خدا کا شکر ہے نیتِ مری خراب نہیں
 تو کیوں کہوں کہ میں ذرہ ہوں آفتاب نہیں

بیانِ درد کو دل چاہیے جنابِ حفظ
 فقط زبانِ میاں متا بلِ خطاب نہیں

مری نیت خراب ہے

فردوس کی طور بھی آفسر شراب ہے
 مجھ کو نہ لے چلو مری نیت خراب ہے
 ذرے کا حُسنِ ذرہ نہیں آفتاب ہے
 مشکل یہ آپڑی ہے کہ زیرِ نقاب ہے
 ہے اک یہی جھلک تو مری حباں جستجو
 کیوں مان لوں کہ آب نہیں ہے شراب ہے
 او مبتلا سے زلیت ٹھہر، خود کشی نہ کر
 تیرا علاج زہر نہیں ہے شراب ہے

ساتی تری نظر نے یہ کیا کر دیا مجھے
 جیسے رگوں میں خون نہیں ہے شراب ہے
 نشہ شراب میں ہے نہ مستی شباب میں
 اس رنگ سے بہشت میں رہنا عذاب ہے
 ہے دستِ محبت مرا جاں بخشِ عجب میں
 میں ہر سہمی رہا تھا وہ سمجھا شراب ہے
 عرضِ سخن کا اب وہ زمانہ کہاں حقیقت
 کہنے کا وقت ہے نہ سنانے کی تاب ہے

افسانہ بناوے

یا عقل کی اُفتاد سے دیوانہ بناوے
 یا عشق کی امداد سے فرزانہ بناوے
 یا پردہ اٹھاوے رُخ جانانہ دکھاوے
 یا ذوقِ نظر سے مجھے بیگانہ بناوے
 یا کر دے مجھے اپنی حقیقت سے خبردار
 یا میری حقیقت کو بھی افسانہ بناوے
 آخر کوئی صورت تو بنے خانہ دل کی
 کعبہ نہیں بنتا ہے تو تجھانہ بناوے
 کرتا ہے تصور ترا کس رنگ کی باتیں
 سُن لے کوئی اک حرف تو افسانہ بناوے

پروازِ خرد کیا ہے نری پست خیالی
 اے ہمت عالی مجھے دیوانہ بنا دے
 اب میری حماقت پر آسٹیکے تو کیوں ہے
 کیا میں نے کہا تھا مجھے فائدہ بنا دے
 اے عقلِ جنوں خیز! مبادا تیرا ہی
 بستے ہوئے ہر شہر کو ویرانہ بنا دے
 دیوانگیِ عشق کے بعد آہی گیا ہوش
 اور ہوش بھی وہ ہوش کہ دیوانہ بنا دے
 ہم خونِ جگر پی کے چلے جائیں گے ساقی
 لے شیشہ دل توڑ دے پیمانہ بنا دے
 ہے عشقِ حقیقہ ایک ہی نسخہ کہ جو مل جائے
 اپنوں کو مرے حال سے بگایہ بنا دے

جسے بُت بنایا خدا ہو گیا

دُعا جس سے کی بے وفا ہو گیا	جسے بُت بنایا خدا ہو گیا
کوئی بھی نہ سمجھا، یہ کیا ہو گیا	فدا ہونے والا خدا ہو گیا
ہوا اُسے اُکھٹا رہا خدا	سفینہ سپر و خدا ہو گیا
میاں ہم دُعا میں ہی کرتے ہے	وہاں اُس نے جو کہ دیا ہو گیا
بنے شیخ صاحبِ مَحَبَّتِ وطن	بُتوں کو بھی سب دے روا ہو گیا
بُتوں کو ترخیر اک شکایت بھی تھی	خدا مُفت میں کیوں خفا ہو گیا

کہہ مائے سعدی کو پڑھ کر مخفیہ
اسیرِ کُند ہوا ہو گیا

میری خزاں کیا بہار کیا

اب سازگار کی بجھے ناسازگار کیا
میں چوبِ خشک، میری خزاں کیا بہار کیا

تم میرا حال پوچھتے ہو بار بار کی
اپنی نگاہ پر بھی نہیں اُمتبار کیا

دکھلا گئے شبیہ تری مُنکر و نکیر
اب نیند آئے گی مجھے زیرِ مزار کیا

تو بخش دے تو خیرِ بڑی بات بھی نہیں
ورنہ مرے گمناہ کا یارب شمار کیا

خادم بھی ہوں، خطاؤں پہ نادم بھی ہوں، حقیقت
اب اور چاہتے ہیں مرے دوست یا ر کیا

آدمی آخر کار کیا کرے

اب وہ نوید ہی نہیں صُوت ہزار کیا کرے
 نخل اُسی رہی نہیں ابر بہار کیا کرے
 دن ہو تو مہر جلوہ گر، شب ہو تو انجم و قمر
 پردے ہی جب ہوں پردہ درنوئے نگار کیا کرے
 عشق نہ ہو تو دل لگی، موت نہ ہو تو خود کشی ،
 یہ نہ کرے تو آدمی آئندہ کار کیا کرے
 اہل ہوس بھی ہیں بہت، خیر نظر نہ آئیے
 یہ تو مگر بتائیے، عاشق زار کیا کرے

موت نے کس اُمید پر، سوئپ دیے ہیں بحر و بر
 مُشتِ غبار ہے بشرِ مُشتِ غبار کیا کرے
 شمع بھی ہے رہیں کس، پھول بھی ہیں اُداس اُداس
 کوئی نہیں ہے آس پاس، گنجِ مزار کیا کرے
 اپنے یکے پہ بار بار، کون ہو روزِ شمار
 مل گیا عذرِ پائدار، قولِ وِستار کیا کرے
 حدِ ہنس نہیں حقیقتِ تیرے خیال میں کوئی
 اہلِ کمال میں کوئی تجھ کو شمار کیا کرے

یہ ہماری زبان ہے پیارے

دل ابھی تک جوان ہے پیارے
 تو مرے حال کا خیال نہ کر
 تلخ کر دی ہے زندگی جس نے
 رات کم ہے نہ چھیڑ، سحر کی بات
 جانے کیا کہہ دیا تھا روزِ ازل
 ہم ہیں بندے مگر ترے بندے
 نام ہے اس کا نا صبحِ مشفق،
 کب کیا میں نے عشق کا دعویٰ

کس مصیبت میں جان ہے پیارے
 اس میں بھی ایک شان ہے پیارے
 کتنی سیٹھی زبان ہے پیارے
 یہ بڑی داستان ہے پیارے
 آج تک امتحان ہے پیارے
 یہ ہماری بھی شان ہے پیارے
 یہ ہر مہربان ہے پیارے
 تیرا اپنا گمان ہے پیارے

میں تجھے بے دنا نہیں کتا
 ساری دنیا کو ہے غلط فہمی
 تیرے کوچے میں ہے سکونِ درنہ
 خیرِ دنیا دے اثر ہی سہی
 شرم ہے، احتراز ہے، کیا ہے
 عرضِ مطلب سمجھ کے ہو نہ خفا
 دشمنوں کا بیان ہے پیارے
 مجھ پہ تو مہربان ہے پیارے
 ہر زمین آسمان ہے پیارے
 زندگی کا نشان ہے پیارے
 پروہ سا درمیان ہے پیارے
 یہ تو اک داستان ہے پیارے

جنگ چھڑ جائے ہم اگر کہ دیں
 یہ ہماری زبان ہے پیارے

کھلتا جا مُرجھاتا جا

او دل توڑ کے جانے والے دل کی بات بتاتا جا
 اب میں دل کو کیا سمجھاؤں، مجھ کو بھی سمجھاتا جا
 ہاں میرے مجروح قبضہ، خشک لبوں تک آتا جا
 پھول کی بہت بُو دہی ہے، کھلتا جا مُرجھاتا جا
 میری چپ رہنے کی عادت جس کا رن بدنام ہوئی
 اب دُہ حکایت عام ہوئی ہے سُنتا جا سُرماتا جا
 یہ دُکھ دُزد کی بکھا بندے دین ہے تیرے دانا کی
 شکرِ نعمت بھی کرتا جا، دامن بھی پھیلاتا جا

چہنیے کا ارمان کروں یا مرنے کا سامان کروں
 عشق میں کیا ہوتا ہے ناصح، عقل کی بات سُجھانا جا
 تجھ کو ابراؤد دنوں سے کام نہ چاندنی راتوں سے
 بہلاتا ہے باتوں سے بہلاتا جا بہلاتا جا
 دونوں نگہ راہِ طلب ہیں رہنا بھی منزل بھی
 دُوقِ طلب ہر ایک قدم پر دونوں کو کھٹکراتا جا
 نفی سے جب پھول کھلیں گے، چُھنے والے چُن لیں گے
 سُنے والے سُن لیں گے، تو اپنی دُھن میں گاتا جا
 آخر تجھ کو بھی موت آئی، خیر حفیظِ حُدا حافظ
 لیکن مرتے مرتے پیارے وجہِ مرگ بتاتا جا

مجھ کو خدا نے کیا دیا

کوئی دوا نہ دے سکے، مشورۂ دعا دیا
 چارہ گروں نے اور بھی درد کا دل بڑھا دیا
 دونوں کو دے کے صورتیں ساتھ ہی آئیں دیا
 عشقِ بیور نے لگا، حُسن نے مُسکرا دیا
 ذوقِ نگاہ کے ہوا، شوقِ گناہ کے ہوا
 مجھ کو سبوں سے کیا ملا، مجھ کو خدا نے کیا دیا
 تھی نہ خزاں کی روک تھام دامنِ خستیاں میں
 ہم نے بھری ہسار میں اپنا چمن لٹا دیا

حُسنِ ظہر کی آبر و صنعتِ برہمن سے ہے
 جس کو صنم بنا لیا، اُس کو حُسنِ برباد دیا
 داغ ہے مجھ پہ عشق کا میرا گناہ بھی تو دیکھ
 اُس کی نگاہ بھی تو دیکھ، جس نے یہ نگل کھلا دیا
 عشق کی مملکت میں ہے، شورشِ عقل نامراد
 اُبھرا کہیں جو یہ فساد، دل نے وہیں دبا دیا
 نقشِ وفا تو میں ہی تھا، اب مجھے ڈھونڈتے ہو کیا
 حرفِ غلطِ ظہر پڑا، تم نے مجھے مٹا دیا
 خُبثِ دُروں دکھا دیا، ہر دہنِ عنایت نے
 کچھ نہ کہ حفیظ نے ہنس دیا مُکرا دیا

مے پیئے ہوئے مینا لئے ہوئے

لب شکر چارہ ساز کا نغمہ لئے ہوئے
 دل در و جاں گداز کا شکوا لئے ہوئے
 اب اشتیاقِ عرضِ تمنا نہیں رہا
 اب ہر کوئی ہے عرضِ تمنا لئے ہوئے
 میری یہ زندگی ہے کہ مرنا پڑا مجھے
 اک اور زندگی کی تمنا لئے ہوئے
 توبہ کئے ہوئے ہوں ورنہ یہاں کوئی
 پھرتا نہ مے پیئے ہوئے مینا لئے ہوئے
 ساقی ہے آج کون کہ ہر کوزہ سفاک
 آتا ہے ایک نور کا دریا لئے ہوئے

دریا سے موج اٹھی، سونے دریا ملیٹ گئی
 مجھ کو لئے ہوئے مری توبہ لئے ہوئے
 پردانہ دل لئے ہوئے جل جائے بھی تو کیا
 جلتی ہے شمع صورتِ زیبا لئے ہوئے
 یہ لن ترانیاں ہیں تو اب کون آتے گا
 بیٹھے رہو گے برقِ تجلے لئے ہوئے
 مردِ دوسیکہ کر بھلا منہ لگائے کون
 بیٹھا ہوں خافتہ میں توبہ لئے ہوئے
 پیشِ حُدا چلا ہوں فرشتے ہیں ساتھ ساتھ
 ساغر لئے ہوئے کوئی مینا لئے ہوئے
 احباب ہی نہیں ہیں ترکِ زندگی حقیقت
 دُنیا چلی گئی مری دُنیا لئے ہوئے

یہ کشتی کون ڈبوتا ہے

کیوں ہجر کے شکوے کرتا ہے کیوں درد کے رونے روتا ہے
 اب عشق کیا ہے تو صبر بھی کر، اس میں تو یہی کچھ ہوتا ہے
 آغازِ مصیبت ہوتا ہے اپنے ہی دل کی شامت سے
 آنکھوں میں پھول کھلتا ہے، تلوں میں کانٹے بوتا ہے
 احباب کا شکوہ کیا کیجے، خود ظاہر و باطن ایک نہیں
 لب اوپر اوپر ہنستے ہیں، دل اندر اندر روتا ہے
 ملا حول کو الزام نہ دو تم ساحل والے کیا جانو
 یہ طوفان کون اٹھاتا ہے، یہ کشتی کون ڈبوتا ہے
 کیا جانتے یہ کیا کھوئے گا، کیا جانے یہ کیا پائے گا
 مندر کا سچباری جاگتا ہے، مسجد کا نمازی سوتا ہے

خیرات کی جنت بھٹکرا دے ہے شان ہی خود داری کی
 جنت سے نکالا تھا جس کو تو اس آدم کا پوتا ہے

آخر تم کیا یاد کرو گے

میرا گھر آباد کرو گے	آخر اک دن شاد کرو گے؟
یاد کرو گے یاد کرو گے	پیار کی باتیں وصل کی رہیں
کس دل سے برباد کرو گے	کس دل سے آباد کیا تھا
تم بھی کچھ ارشاد کرو گے؟	میں نے اپنی قیمت کہہ دی
تم کیا مجھ کو شاد کرو گے	زر کے بند و عقل کے اندھو
پھر تم بھی منہ یاد کرو گے	جب مجھ کو چُپ لگ جائے گی
کوئی بستم ایجاد کرو گے	اور تمہیں آتا ہی کیا ہے
بندے کو آزاد کرو گے	تنگ آکر لے بندہ پرور
تم مجھ کو برباد کرو گے	میرے دل میں بسنے والو
آخر تم کیا یاد کرو گے	حسن کو رُسوا کر کے مروں گا

حشر کے دن ہمیشہ نامح
تم میری امداد کرو گے

مجھے منظور نہیں

حُسنِ پاسبانِ رضا ہو مجھے منظور نہیں
 شرط، اطہارِ ندامت ہے جو بخشش کے لئے
 حُسنِ والے مرے قابل ہیں یہ دعویٰ ہے برا
 جس نے اس دور کے انسان رکھے ہیں پیدا
 حشر کے دن مجھے سچ کہنے کی توفیق نہ دے
 دوستوں کو بھی ملے درد کی دولت یا رب
 اب کوئی راز نہیں، اب سے مرا محرمِ راز
 جلوے لاکھوں ہیں خدا ایک ہے اے سجدہ شوق

میں کہوں، تم مجھے چاہو مجھے منظور نہیں
 اے جوانی کے گناہو مجھے منظور نہیں
 حُسنِ والوں کو سزا ہو مجھے منظور نہیں
 دُہی سیرا بھی حُسنِ اہو مجھے منظور نہیں
 کوئی ہنگامہ بپا ہو مجھے منظور نہیں
 میرا اپنا ہی حُسنِ اہو مجھے منظور نہیں
 کوئی بھی میرے سوا ہو مجھے منظور نہیں
 بہت دمِ نغزِ شش پا ہو مجھے منظور نہیں

مجھ کو اے کاتبِ تقدیر تماشا نہ بنا
 یہ بُری بات ہے، ترغیبِ گنہ دل کو نہ دو
 اے بہو تم پر اندھا دھند مرے خلقِ خدا
 حرم و دیر کو بندوں سے ہے جو کچھ منظور
 عشق چہرے پہ لکھا ہو مجھے منظور نہیں
 میری معصوم نگاہ ہو مجھے منظور نہیں
 اور خدا دیکھ رہا ہو مجھے منظور نہیں
 یہی منظورِ خدا ہو مجھے منظور نہیں
 تو برا راہِ مٹا ہو مجھے منظور نہیں
 تیرے کردارِ سکندر تیری رفتارِ خسرو

خفگیِ میکہ والوں کی، الٹی توبہ
 کوئی غرض ہو کہ خفا ہو مجھے منظور نہیں

جہز مرے خستیار کے

اپنے ہی دل کو مار لیا مار مار کے
 دیکھے تو کوئی جبہ مرے خستیار کے
 مارے ہوئے ہیں معرکہ عہتبار کے
 مارے ہوئے ہیں وعدہ دیدار کے
 گنتے ہیں سانس زندگی مُستعار کے
 بیٹھے ہیں انتظار میں روزِ شمار کے
 یہ قیدِ زندگی یہ رستمِ روزگار کے
 مہِ نظر ہے کیا مرے پروردگار کے

کس منہ سے لے تو مجھے بے موت مار کے
 جاؤ گے سامنے ہرے پروردگار کے
 وہ کون تھے جو عشق کو اک کھیل جان کر
 کھیلے بھی اور چل بھی دئے حبت ہمارے
 کیوں کھیتا ہوں میں یہ کسی کو خبر نہیں
 اجاب ہیر پھیر میں ہیں حبت ہمارے
 ہم بار بار چاک گریبں نہ کر سکے
 بے کار بار بار دن آئے بہار کے
 کشمیر ہے وہ جہلمہ مگر اس کی راہ میں
 وقت کی وادیاں ہیں پہاڑ انتظار کے
 کشمیر میں جھینٹ جہلے دل کی یادگار
 ڈھیری ہے ایک راگھ کی نیچے چنار کے

ذرا اپنے اللہ کو یاد رکھنا

مرے دیدہ و دل کو آباد رکھنا	مجھے شاد رکھنا کہ ناشاد رکھنا
تمہیں یاد آئیں گے ہم یاد رکھنا	بھلائی نہیں جاسکیں گی یہ باتیں
الہی انھیں شاد و آباد رکھنا	وہ ناشاد و برباد رکھتے ہیں مجھ کو
اُسی کو تیرے تیغِ بسیرا د رکھنا	تمہیں بھی قسم ہے کہ جو سر جھکا دے
ذرا اپنے اللہ کو یاد رکھنا	میں گے تمہیں راہ میں بُتکدے بھی
وہیں ایک مسجد کی بُنیاد رکھنا	جہاں بھی نشے میں قدم لٹکھرائیں
نظر میں فرشتوں کی اُفتاد رکھنا	ستاروں پہ چلتے ہوئے ابنِ آدم!

حَفِیْظ اپنے افکار کی سادگی کو
تکلف کی الجھن سے آزاد رکھنا

فریب کھائے جا

کبھی زمیں پہ کبھی آسماں پہ چھائے جا
 اجاڑنے کے لئے بستیاں بسائے جا
 بخضر کا ساتھ دیے جا قدم بڑھائے جا
 فریب کھائے ہوئے کا فریب کھائے جا
 تری نظر میں بتا رہے ہیں اے مے پیارے
 اڑائے جاتے اسلاک خاک اڑائے جا
 نہیں عتاب زمانہ خطاب کے قابل
 ترا جواب یہی ہے کہ منکر لائے جا
 اناڑیوں سے تجھے کھینا پڑا اے دوست
 بُجھا بُجھا کے نئی چال، مات کھائے جا
 شراب خُم سے دیے جا، نشہ تلبسم سے
 کبھی نظر سے کبھی جام سے پلائے جا

جانِ برادرِ خفنا نہ ہو

میری کوئی خطا نہیں ، مجھ پر خفنا نہ ہو
 اُس بُت کو دیکھ داؤرِ محشر خفنا نہ ہو
 چاہوں تو اب بھی جانبِ منزلِ ملطپیں
 گمراہ اس لئے ہوں کہ نہ خفنا نہ ہو
 توہینِ حُسنِ آہ بھی ہے ضبطِ آہ بھی
 دونوں طرح کہیں وہ ستگر خفنا نہ ہو
 انِ راہِ دہل میں بیٹھ کے میٹھی مئے طہور
 پتیا ہوں تاکہ ساقی کو نہ خفنا نہ ہو

ساتی ہزار تو بہ نثار اس عتاب پر
 ماں ماں پلا پلا مجھے ساعر خفا نہ ہو
 بے وقت بے محل، کوئی مقصد نہ مدعا
 یوں عرض حال ہو تو وہ کینہ خفا نہ ہو
 نالے کو ضبط کرتے ہوئے دم الجھ گیا
 کوشش یہ تھی کہ اب مکر خفا نہ ہو
 پیش خدا بھی کھل نہ سکا بتکدے کا راز
 اس خوف سے کہ وہ بُت کا فر خفا نہ ہو
 اے مدعی یہ رنگ اڑانا محال ہے
 دیکھ اس غزل کو جانِ برادر خفا نہ ہو
 ڈرتا ہوں اس نزاکتِ معنی سے اے حفیظ
 اک بد مذاق منہ بہ سخن خفا نہ ہو

بعد فنا کیا ہوگا؟

ذکرِ بیداد و بتاں پیش خدا کیا ہوگا
 زندگی میں نہ ہوا بعد فنا کیا ہوگا
 ہر قدم جس کو تئی چال نہ چلنی آئے
 وہ تو رہزن بھی نہیں رہنا کیا ہوگا
 کوئی بھی اب تو ٹھہرتا نہیں معیارِ نظر
 آدمی شانِ خدا ہے تو خدا کیا ہوگا
 حاصلِ عشق ہے رسوائی بھی ناکامی بھی
 حاصلِ عہد نہ جانے ابھی کیا کیا ہوگا

پھر کہ ہر جاہلیں گے رائے ہوئے بُت خانے کے
 درِ کعبہ بھی اگر وا نہ ہوا کب ہوگا
 تیری گفتار بہت تلخ ہے واعظ یہ بتا
 خُلد کی پاک شہابوں کا مزا کیا ہوگا
 میں گنہگار بھی نکلا تو بہت معمولی،
 حشر میں اور بُرا حشر ہر اکب ہوگا
 شیخ کے منہ سے تو نکلی ہیں مزے کی باتیں
 ہم یہ سمجھے تھے جب زنا ہم خدا کیا ہوگا
 بغض نے پھونک دیا گلشنِ اُردو کو حسیط
 آنسوؤں سے ترے یہ باغ ہر اکب ہوگا

وہ جانیں یا نہ جانیں

بُتوں کی کوئی بات سچی نہ مائیں
 نہ ان کے دہن ہیں نہ ان کی زبانیں
 لٹاتے ہیں ایسا شیخ و ہرمن
 بڑی رونقوں پر ہیں دونوں دکانیں
 نہ ٹوٹیں گی خاموشیاں بُت کمروں کی
 فضاؤں میں گونج کریں گی اذانیں
 جوانی گئی، پھر بھی ہم اور ناصح
 جہاں مل گئے چھڑ گئیں داستانیں

جنوں سے نہ اُجھیں ابھی اہل دانش
ابھی کچھ دنوں عمتل کی خاک چھانیں

ہمیں عشق ہے اُن سے ہم جانتے ہیں
وہ سمجھیں نہ سمجھیں وہ حبائیں نہ حبائیں

جہاں اہل دل آگیا کوئی زود پر
بکھتے تیر اور جھبک پڑیں دو کمانیں

بہت دن گزارے ہیں قیدِ سخن میں
حفیظ آؤ آزاد ہونے کی ٹھانیں

زمانہ سازی

نہ چلے گی حشر کے دن یہ تری سُخن طہ سازی
 کہ تُو نامہ عمل پر، نہ شہید ہے نہ غازی
 نہ متاع تُو رحل نہ تُو حور ہی سے وصل
 نہ تُو خود فریب و اعظ نہ تُو سادہ دل غازی
 یہ حقیقت مجازی، تری داستانِ بندی
 بہ درِ بتانِ بہندی ترا حبدہٴ حجازی
 تری زندگی ریاض ہے، مگر اس کا غم ہی کیا ہے
 کہ ابھی بچھا ہوا ہے ترا دایم پاکبازی

تُو مجھے بھی دے رہا ہے شرفِ نیازِ مندی
 تری شانِ بے نیازی، تری شانِ بے نیازی
 کوئی بات ہے کہ چپ ہوں تجھے کامراں سمجھ کر
 مجھے بے زباں سمجھ کر نہ دکھا زباں درازی
 سرِ بلند میرا، نہیں ٹٹمتی تیرا
 میں شہیدِ عشقِ رومی، میں قسبیلِ علمِ رازی
 ترے ناز میں اٹھاؤں، اگر اب بھی دیکھ پاؤں
 کوئی اک نطفہ فریبی، کوئی ایک دلِ نوازی
 یہ محال تو نہیں تھا مرے دوست دوست رہتے
 سگولے حقیقتِ مجھ سے نہ ہوئی زمانہ سازی

چند اہل دل سمجھتے ہیں

حیدنوں کو ہم اپنے قل میں شامل سمجھتے ہیں
 مگر وہ اور کوئی ہے جسے قابل سمجھتے ہیں
 ابھی کچھ لوگ زندہ ہیں خدا کو ماننے والے
 بتان بہن رچن کو دید کے قابل سمجھتے ہیں
 ہوئے ہیں شیخ جب سب مختلف بتانے کے اندر
 انھیں ہم جیتے جی فردوس میں داخل سمجھتے ہیں
 خدا رکھے ہمارے ناخدا ہیں موج کے بندے
 جہاں خود ڈوبنا چاہیں وہیں ساحل سمجھتے ہیں

پگھلتی جائیں شمعیں اور جلتے جائیں پروانے
 اسی کو اہل محفل گرمی محفل سمجھتے ہیں
 وفا کے مسئلے میں کہ گتے اک حرف حق ہم بھی
 ہمارے دوست ہم کو دار کے قابل سمجھتے ہیں
 بڑھو، ہمت کرو، اندھے گڑھے میں جھانکنے والو
 تمہارے رہنما تم کو سرسبز نزل سمجھتے ہیں
 بیانِ ورد پر اہلِ زباں سے داد ملتی ہے
 زبانِ درد لیکن چنید اہلِ دل سمجھتے ہیں
 حفظِ اپنی ترقی شعریں یہ ہے کہ اس فن کو
 بہت آسان سمجھتے تھے، بہت مشکل سمجھتے ہیں

داستان گم رہی اپنی

بہت ہی مختصر ہے داستان گم رہی اپنی
 قدم گھر سے نکالا اور سنسنل آگئی اپنی
 خدا ناظر تھا اپنا اور حاصر تھی خودی اپنی
 مگر تہے کے در پر چھک رہی تھی بندگی اپنی
 اٹھائے کیوں نہ طوفانِ ملامت عاشقی اپنی
 سمندر پار سے لایا ہے دل اپنا خوشی اپنی
 وہاں اک شوخی رنگیں کی صورت میں دلِ سادہ
 یہاں دُنیا سے معنی بالا راہ سادگی اپنی

گل اندر گل بہار اندر بہار بس حُسن کا گلشن
 فقط اک خارِ دامن کو نطفہ آئی کمی اپنی
 نتیجہ کا مہیا بنی کیوں نہ ہوتا تختِ انوں کا
 جفا تھی مُبتدی اُن کی وفا تھی مستی اپنی
 حسین ہم اُن کو سمجھے تھے مگر اتنا نہیں سمجھے
 کہ یہ دل کی لگی تھی یا فقط اک دل لگی اپنی
 جہانِ دردِ آخر لے لیا اک دل کے بدلے میں
 اسی سوئے میں سودائی نے پانی بہتری اپنی
 حفیظ ارباب نے نیا جو بھی چاہیں شوق سے کہ لیں
 ہمیں اتنا ہی کہنا ہے کہ دُسیا بس گئی اپنی

جو میں نے کبھی رونا چاہا

عشق نے حُسن کی بیداد پہ رونا چاہا
 تخمِ احساں دماغ میں بونا چاہا
 آنے والے کسی طوفان کا رونا رو کر
 ناخدا نے مجھے ساحل پہ ڈبونا چاہا
 سنگدل کیوں نہ کہیں تگدے والے مجھ کو
 میں نے پتھر کا پرستار نہ ہونا چاہا
 حضرت شیخ نہ سمجھے مرے دل کی قیمت
 لے کے قبیح کے رشتے میں پرونا چاہا

کوئی مذکور نہ تھا غیب کا لیکن تم نے
 باتوں باتوں میں یہ نشتر بھی چھبونا چاہا
 دین تر سے بھی سرزد ہوا اک جبرِ عظیم
 حشر میں نامہ اعمال کو دھونا چاہا
 مرتے مرتے بھی توقع رہی دلداری کی
 رکھ کے سرزائے تفتیر پہ سونا چاہا
 ہائے کس وزد سے کی ضبط کی یقین مجھے
 ہنس پڑے دوست جو میں نے کبھی رونا چاہا
 جنسِ شہرت بہت ارزاں تھی گو میں نے حقیقت
 دولتِ وزد کو بے کار نہ کھونا چاہا

اور جینا چاہتا ہوں

نہ پیتا ہوں نہ پینا چاہتا ہوں
 سخن کا اک مستدینا چاہتا ہوں
 نگاہ و دل کی یک رنگی تھی درکار
 وہ سمجھے جام و مینا چاہتا ہوں
 برا مقصود پر وہ ہے نہ جملہ
 فروغ چشم بیسنا چاہتا ہوں
 نہ توڑ دوستور شتہ وفا کا
 میں دل کے زخم سینا چاہتا ہوں
 ابھی باقی ہے مینا و مصیبت
 ابھی کچھ اور جینا چاہتا ہوں
 حفیظ اس کا سبب مجھ سے نہ پوچھو
 مگر میں آج پینا چاہتا ہوں

سجدہ گاہ میں

جن کا ظہور ہو نہ سکا مہر و ماہ میں
 وہ جلوہ ہائے نور ہیں میری نگاہ میں
 اونگ شوق سجدہ گوارا ہوا تجھے
 سرکاٹ کر نہ پھدیک دیا سجدہ گاہ میں
 تو عشق ہے کہ موت مجھے کچھ خبر نہیں
 چلتا ہوں آنکھ بند کیسے تیری راہ میں
 تیرے سوا کہیں بھی ٹھہرتی نہیں نگاہ
 تیرے سوا کوئی بھی نہیں ہے نگاہ میں
 ترک و فاکتے سے بھی کس فائدہ حقیقت
 اب جبکہ عمر بیت چکی اس گنہ میں

مجھ کو مرے خدا سے لپٹاں نہ کیجئے

اُن گمبُوؤں میں شانہ ارماں نہ کیجئے
 خُونِ جگر سے دعوتِ شرکاں نہ کیجئے
 مرجائیے نہ کیجئے ذکرِ بہشت و خُور
 اس خواب کو بھی خواب پریشاں نہ کیجئے
 باقی ہو جو بھی حشر ہیں پر اٹھائیے
 مرنے کے بعد زسیت کا سماں نہ کیجئے
 دوزخ کو دیجئے نہ پراگندگی مری
 شیرازہ بہشت پریشاں نہ کیجئے

شاید ہی جہاں کسی محسنوں کا گھر بنے
 ویرانہ بھی اگر ہے تو ویراں نہ کیجئے
 کیا ناحسدا بغیر کوئی ڈوبتا نہیں
 مجھ کو مرے حسد سے لپٹاں نہ کیجئے
 ہے بندے میں بھی اسے ایمان کا خیال
 کیوں عہت بارِ مردِ مسلمان نہ کیجئے
 بارِ نگاہِ لطف اٹھایا نہ جائے گا
 احساں یہ کیجئے، کہ یہ احساں نہ کیجئے
 آئینہ دیکھتے مری صورت نہ دیکھئے
 میں آئینہ نہیں مجھے خیراں نہ کیجئے
 تو ہی عسزِ خاطرِ احباب ہے حسدِ سیٹ
 کیا کیجئے اگر تجھے مشرباں نہ کیجئے

خانہ خرابی

دو نوں کا حاصل خانہ خرابی	نا کامی عشق یا کامیابی
بادہ شبانہ جام آفتابی	آنکھیں میست چہرہ کتابی
لب لباب نابی عارض گلہابی	پھولوں میں دھپول رنگوں میں درنگ
دیوانہ ہو جا بن جاشدابی	دُنیا و دیں سے بیگانہ ہو جا
میرا تبسم حاضر جوابی	اُن کا بہانہ برجستہ گوئی
یہ پردہ داری یہ بے حجابی	دیندار کر دے کافر بنا دے
تختہ الٹ دیں ہم ہفتلابی	ہیں تختِ دل پر سرکار، ورنہ

دربان سے ہوں دست و گریباں
الحمد للہ یہ باریابی!

رُتِ سَنگِیت

نئے سے جب پھول کھلیں گے
 چُنے والے چن لیں گے
 سُننے والے سُن لیں گے
 تو اپنی دُھن میں گاتا جا

تیری مہنزل دُور

منظر آب و گل سے

تیری مہنزل

دُور

مُسافر

تیری مہنزل دُور

نظارے اس آب و گل کے

رہزن ہیں تیری مہنزل کے

نغمہ ہو یا رنگِ گل ہو

سب پردے ہیں نگاہ و دل کے

تو ہے طالبِ نور

مُسافر

تیری مہنزل دُور

تیری منزل

مسافر

دور

تیری منزل دور

لیلیٰ کے محل سے نکل جا

شیریں کی محفل سے نکل جا

حسن و ادا دونوں کے در پر

دل روکے تو دل سے نکل جا

دل سے نہ ہو مجبور

مسافر

تیری منزل دور

تیری منزل

دُور

مُسافر

تیری منزل دُور

کوہ و بیاباں جن کا ٹھکانا

اُن کی راہ نہ ہرگز جانا

ہمت سے اور نکلے سے غاری

قیس بچپا را اک دیوانہ

کو کہن اک مزدور

مُسافر

تیری منزل دُور

تیری منزل

دُور

مسافر

تیری منزل دُور

دُنیا کے بازاری دھندے

زر کے گنگا جمنی پھندے

کیا اندھی ہے دُنیا جس پر

اندھے ہیں دُنیا کے بندے

عاجز اور مغرور

مسافر

تیری منزل دُور

تیری منزل

دُور

مُسافر

تیری منزل دُور

جس میں نہ ہو چلنے کا یارا

وہ کر لے جنت کو گوارا

شیخ کو لینے دے یہ سہارا

یہ بے چارہ ضعیف کا مارا

خُور سے ہے مسخُور

مُسافر

تیری منزل دُور

خالی عقل و فکر سے

تیری منزل

دُور

مسافر

تیری منزل دُور

جس منزل کی تجھ کو لگن ہے

اُس منزل کی راہ کھٹن ہے

اُس منزل تک عشق ہی جائے

عقل بچپاری خستہ تن ہے

فکر وہاں معذور

مسافر

تیری منزل دُور

تیری منزل

دُور

مسافر

تیری منزل دُور

راہ میں حائل کوہِ سینا

جس کی چوٹی پہلا زینہ

دل آئینہ ہے تو تجھ پر

جھلکیں گے انوارِ مدینہ

بجلیوں میں مستور

مسافر

تیری منزل دُور

تیری مہنڈ

دُور

مسافر

تیری مہنڈ دُور

اُور بڑھیں تو قیامت ٹوٹے

روشنیوں کا چشمہ پھوٹے

مُوسٰی نے پہلے ہی قدم پر

غش کھایا اُور سستے چھوٹے

جل کر رہ گیا طُور

مسافر

تیری مہنڈ دُور

گر دُشہ جام سے

تیری منزل

دُور

مُسافر

تیری منزل دُور

جو تیجھے مطلوب کے جائے

دوارے پر محبوب کے جائے

تیر کے نکلے عہد احمد

دریا دریا ڈوب کے جائے

الْمَاسِبِ دَسْتُور

مُسافر

تیری منزل دُور

تیری منزل

دُور

مُسافر

تیری منزل دُور

بعض تو بے خود ہو جاتے ہیں

بعض خودی میں کھو جاتے ہیں

رہ جاتے ہیں سِر کٹا کر

دارِ چہ چڑھ کر سو جاتے ہیں

سرمہ اور فنصُور

مُسافر

تیری منزل دُور

تیری منزل

دور

مسافر

تیری منزل دور

خضر رسیق راہ نہیں ہے

منزل سے آگاہ نہیں ہے

اس رستے میں سنگی ساتھی

کوئی بحسنہ اللہ نہیں ہے

وہ بھی تحت شعور

مسافر

تیری منزل دور

تن آسانی سے

تیری منزل

دُور

مُسافر

تیری منزل دُور

خانقہوں میں درسِ فقیری
 چپہ کشتی اور گوشہ گیری
 راحت کے جُجروں سے نکل کر
 دایم آزادی کی اسیری
 کون کرے منظور

مُسافر

تیری منزل دُور

تیری منزل

دُور

مُسافر

تیری منزل دُور

دیوانہ فدا نہ جانے

فزا نہ دیوانہ جانے

کوئی تیری بات نہ سمجھے

ہر کوئی بیگانہ جانے

کوئی نہ ہو مسرور

مُسافر

تیری منزل دُور

تیری منزل

دُور

مُسافر

تیری منزل دُور

شمع مثال پگھلتے جانا

پروانہ ساں چلتے جانا

جلنا اور پگھلنا ، لیکن

چلنا ، چلنا ؛ چلتے جانا

کس کا ہے مقدر

مُسافر

تیری منزل دُور

منجدھار

کامی کھیوندار

جھوٹا سب سنار

پیارے

جھوٹا سب سنار

سوہ کا دریا لوبھ کی نیپا

کامی کھیوندار

نوج کے بل پر چل نکلے تھے

آن پھنسے منجدھار

پیارے

جھوٹا سب سنار

دُھن کی دُھن استوار

جھوٹا سب سنار

پیارے

جھوٹا سب سنار

تن کے اُجلے من کے میلے

دُھن کی دُھن اسوار

اُوپر اُوپر راہ بتائیں

اندر سے بٹ مار

پیارے

جھوٹا سب سنار

بیچیں سُرگ اُدھار

جھوٹا سب سنا

پیارے

جھوٹا سب سنا

گیان دھیان کے پتر باہیں

بیچیں سُرگ اُدھار

گیانی پا تر بن کر ناچیں

نقد کریں بیوپار

پیارے

جھوٹا سب سنا

نیکے چور چکار

جھوٹا سب سنار

پیارے

جھوٹا سب سنار

چولے دھار کے دین دھرم کے

نیکے چور چکار

ان چلوں کی آڑ سے چمکے

دو دھاری تر وار

پیارے

جھوٹا سب سنار

درشن درشن

درشن درشن میسرا

بس

درشن درشن میسرا

مالی لاکھ کرے رکھوالی

بھونڈا گو بنجے ڈالی ڈالی

پھول پھول پر ڈیرا

بس

درشن درشن میسرا

ہر کوئی ہے قیدِ قفس میں بلب رنگ میں مچھلی رس میں

اپنا من ہے اپنے بس میں

جوگی والا پھیرا

بس

درشن درشن میسرا

درشن درشن میرا

بس

درشن درشن میرا

جس پردے میں شام برابر ہے

جس گوکل میں مڑلی باجے

ساوہو کریں بسیرا

بس

درشن درشن میرا

رنگ رنگ سے جلے جوالا انگ انگ کا رُوپِ زِلا

نہیں چسپیں درشن کی مالا

سا جے سا بھج سویرا

بس

درشن درشن میرا

بسنّت رُت

بسنّت کی رُت آگئی
ترے وطن پہ چھپ گئی

ہوا کا رُخ پلٹ گیا

خزاں کا زور گھٹ گیا

اَلَم کا ابر چھٹ گیا

پہن کے حبّ مہِ نو

چمن ہوا بھرا ہوا

کوئی نہیں — بس ایک تُو

ہے آج بھی مُرا ہوا

بسنّت کی رُت آگئی

ترے وطن پہ چھپا گئی

بسنت کی رُت آگئی
 ترے وطن پہ چھپا گئی
 بگاڑ کو سنوار کے
 دلوں کا میل اُتار کے
 دن آگئے ہمارے
 اُتار دے اُتار دے
 یہ خول تو بھی ہوش کا

طرب کن سنوار دے
 جنوں گرم جوش کا
 بسنت کی رُت آگئی
 ترے وطن پہ چھپا گئی

بسنت کی رُت آگئی

ترے وطن پر چھپ گئی

بٹا بھی دے کدورتیں

کہ نیک ہیں مہورتیں

گلوں کی دیکھ صورتیں

اُمید کی ہلک تو ہے

یہ پھول زرد ہی سہی

نزد کی ہلک تو ہے

ہو این سرو ہی سہی

بسنت کی رُت آگئی

ترے وطن پر چھپ گئی

بسنت کی رُت آگئی

ترے وطن پہ چھپ گئی

جو تو وفا سرشت ہو

تو سرخرو یہ کشت ہو

یہی حسین بہشت ہو

یہ زرد رنگ خوب ہے

مگر حسُن کا رنگ ہے

پھر اس سے بڑھ کے خوشی

ترے ہی خوں کا رنگ ہے

بسنت کی رُت آگئی

ترے وطن پہ چھپ گئی

گھر پھونک تماشا

قفس کے راحت پسند ننھی مزے میں ہیں چھپا رہے ہیں
 چین پہ آتش بس رہی ہے
 بسنت کے گیت گاتے ہیں
 اُٹھے ہیں صیاد لے کے پھندے قدم قدم پر بچا ہے ہیں
 خزاں رسیدہ چین میں شاید
 بہار کے دن پھر آ رہے ہیں
 لٹکا کے آگ اس چین کے مالی جلا چکے پھول پات ڈالی
 بہار کے اب فقط خیالی پلاؤ بیٹھے پکا رہے ہیں

ہوا کے یہ سر و سر دھونکے
 یہ گرم گرم اشک بلبلیوں کے
 لگی ہوئی کو بھجار رہے ہیں، بھجھی ہوئی کو جگا رہے ہیں
 دبی ہوئی حسرتوں میں شاید
 کہیں کہیں آگ لگ گئی ہے
 گرمی ہوئی پتھریں کے تو دئے دھوئیں کے بادل اٹھا رہے ہیں
 حفیظ صاحب سے کوئی کہوے
 خزاں کی سختی کو بھول جائیں
 ترانے گائیں غزل سنائیں جلی کٹی کیوں سنار ہے ہیں

منتر

کیوں تکرار کریں

ہم آخر

کیوں تکرار کریں

اے ساجن، اے میرے بھتیجا لو بھ کے مارے لڑیں کھو تیا

ٹول رہی ہے دیش کی نیا

یاد کریں کیوں کر ڈوی یادیں آؤ ان یادوں کو بھلا دیں

آؤ یہ مُردے فنا دیں

سب آشائیں ماتھ بٹائیں

نیا پار کریں

کیوں تکرار کریں

تم نے ستایا ہم نے جہنم کی ہم سے ہوئی یا تم نے خطا کی
 دونو بھولے رسم وفا کی

دونو مور کھ بھولے بھالے پڑ گئے ہم سانپوں کے پالے
 دس گئے ہم کو دسے والے

کروڑ کپٹ ہے ساتھی کس کا پریت ہی منتر ہے اس بس کا
 آد پریم کی جوت جگائیں

من تیار کریں

کیوں تگوار کریں

ہم آخر

کیوں تگوار کریں

افرنک کی دُنیا

وہ جس کی گرہ میں نہ جوانی ہو نہ زرخیز
اس راہ سے اللہ نہ کرے اُس کا گزرو

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے سنہ ۳۸
نیزنگ فرنگ سنہ ۳۸
پر دیں میں دیں راگ مغرب کے لبوں پر ہے مرے خون کی مالی

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پایے

رُشکِ مَدَن ہے باغِ وطن بھی

گل بھی ہیں مَوْجُو د گلِ پیسِ مَن بھی

نازکِ بدن بھی غنچہِ دہن بھی

لَیْلےِ رُوش بھی شیریں سخن بھی

کچھ کم نہیں وہ

اُجڑا چمن بھی

اُس کے بھی اک بار کر لے نظارے

اپنے وطن میں

سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

اُس حُسن میں ہے ہلکا ناک بھی
 نے کا نشہ بھی لُطفِ گزک بھی
 رنگین کلیاں جن میں ہلک بھی
 دل میں وفا بھی دزد اور تپک بھی

روئے زمیں بھی

چشمِ فلک بھی

سب ہیں بھکاری بھارت کے دوارے

اپنے وطن میں

سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے
 حُسن و نغمہ کی خاموش گاتیں
 عشق و ہوس کی دھو میں برائیں
 سب نہیں وہاں بھی یہ وار داتیں
 دیکھی نہیں کیا تر نے وہ راتیں

دو لہا دُھن جب
 کرتے ہیں باتیں
 مہنتی ہیں کلیاں کھلتے ہیں تارے
 اپنے وطن میں
 سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

مے خانے بھی ہیں پیر معناس بھی

ہنگامے بھی ہیں خاموشیاں بھی

نُطمِ بہاراں رنگِ حناں بھی

ساگر بھی موجود آبِ رواں بھی

جو کچھ یہاں ہے

سب ہے وہاں بھی

پھرتے ہو بے کار کیوں مارے مارے

اپنے وطن میں

سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے
 سودے وہاں بھی کرتے ہیں شہری
 چلتے ہیں مسر سو سکے سنہری
 دیات پر ہے اک نیند گہری
 لہریں وہاں بھی لیتے ہیں لہری
 بازار مسندی
 تھانہ کچھری
 کرتے ہیں دن رات سب وارے پیارے
 اپنے وطن میں
 سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے
 اپنے وطن کے دن رات نیارے
 وہ چاند سورج نوری غبارے
 وہ ندیاں ہیں امرت کے دھارے
 دنیا سے اُونچے پر بت ہمارے
 باغ اور آکاش
 پھول اور تارے
 سب منتظر ہیں میرے تمہارے
 اپنے وطن میں
 سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے
 وہ سیدھی سادی بچوں کی مائیں
 زلفیں ہیں جن کی کالی گھٹائیں
 آنچل میں جن کے ٹھنڈی ہوائیں
 بھول گئے کب تک اُن کی دمنائیں
 کب تک کرو گے
 اُن پر جمنائیں
 چھوڑا ہے اُن کو کس کے سہارے
 اپنے وطن میں
 سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے
 معصوم ، معصوم بھولی نگاہیں
 دل ڈھونڈتا ہے جن کی سپاہیں
 رکن حسرتوں سے تکتے ہیں راہیں
 وہ گرم آنسو وہ سرد آہیں
 مانیں نہ مانیں
 چاہیں نہ چاہیں
 کھینچیں گے اک دن اُن کے اشارے
 اپنے وطن میں
 سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے
 گردن جھکاؤ تصویر دیکھو
 بنگال دیکھو کشمیر دیکھو
 خواب جاناں کی تعبیر دیکھو
 با وصف تخریب تعمیر دیکھو

آنکھوں سے اپنی
 تصویر دیکھو
 اپنے خزانے تم نے ہمارے
 اپنے وطن میں
 سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے
 سب کچھ ہے پیارے اپنے وطن میں
 ہے مشیت زردار مال اور دھن میں
 مزدور اب تک مَرْدہ کفن میں
 لیکن ہے وہ بھی اپنی لگن میں
 پھر گمِ غمِ بستی ہے
 گو کل کے بن میں
 نے بنسری کی جمن کنارے
 اپنے وطن میں
 سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے
 ماضی سے بہتر بے شک نہیں حال
 علم و ہنر کا پھر بھی نہیں کال
 ٹیگر کا ساز جادوئے بنگال
 پنجاب کا ناز اعجازِ اقبال
 اور یہ مسافر
 آوارہ پامال
 ہیں متابل دید سارے کے سارے
 اپنے وطن میں
 سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے
 دل میں اگر ہے کوئی حسینہ
 کر لے اُسے بھی تعویذِ حسینہ
 لے چل وطن میں اپنا خزینہ
 ہو زیبِ خاتم یہ بھی نگینہ
 ساحل پہ پہنچے
 جس دم سفینہ
 تو اپنے منہ سے خود ہی پکارے
 اپنے وطن میں
 سب کچھ ہے پیارے

نیزنگِ فرنگ

نیزنگِ طلسمات ہے افونگ کی دُنیا
 قیمت نے دکھائی یہ نئے رنگ کی دُنیا
 رقص و طرب و نغمہ و آہنگ کی دُنیا
 ہنگامہ و ہول و منتن و جنگ کی دُنیا
 فردوس بھی ہے خوف سے خالی بھی نہیں ہے
 اصلی جو نہیں ہے تو خبیالی بھی نہیں ہے

رنگینی گل ، بارِ ثمر دیکھ رہا ہوں
 حُسنِ عمل و حُسنِ نظر دیکھ رہا ہوں
 ہر سمتِ خداوائیِ زور دیکھ رہا ہوں
 سرمایہ و محنت کا اثر دیکھ رہا ہوں
 اس عقل نے ہمت سے بڑا کام لیا ہے
 تکلیف اٹھائی ہے تو آرام لیا ہے
 خیراں ہوں سب راہ گزر دیکھ رہا ہوں
 اک حشرِ ساحۂ نظر دیکھ رہا ہوں
 ہنگامۂ انبوہ بشر دیکھ رہا ہوں
 ہر فرد کو بے خوف و خطر دیکھ رہا ہوں
 اس بھیڑ میں لکڑا کے گزرتا نہیں کوئی
 کمزور کی توہین بھی کرتا نہیں کوئی

آفاق پر از فتنہ و شر دیکھ رہا ہوں
 یہ روز و شب و شام و سحر دیکھ رہا ہوں
 قوموں کی ہلاکت کا ہنر دیکھ رہا ہوں
 دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں
 جو دیکھ رہا ہوں وہ بیاں ہو نہیں سکتا
 آنکھوں سے کبھی کاہِ زباں ہو نہیں سکتا
 مٹی ہی نہیں آگ بھی پانی بھی ہوا بھی
 مغلوب نظر آتے ہیں زخمیدہ پا بھی
 اک زلزلہ ہے زیرِ زمین، زیرِ سما بھی
 خیران فرشتے بھی ہیں شاہدِ خدا بھی
 دیوار شکستہ ہوئی زندانِ بےست کی
 انسان کے پنجے میں ہے تقدیرِ فنا کی

شاعر ہوں برا کام نہیں فلسفہ رانی
 کھلتی ہے مجھے ٹھوس نتائج کی گرانی
 انسان کی تصویر نئی ہو کہ پُرانی
 مطلوب مجھے حُسن ہے اور حُسن معانی
 اللہ کے بندوں سے مجھے بُسید نہیں ہے
 پیارے مری دُنیا میں کوئی غیب نہیں ہے
 مغرب میں جایا ہے جو نور شید نے ڈیرا
 لازم ہے کہ چندے رہے مشرق میں اندھیرا
 جب رات گزر جائے گی آنے کا سویرا
 ایام پہ کچھ زور نہ تیرا ہے نہ میرا
 یہ دُور شب و روز و مہ و سال رہے گا
 گردش ہے جو قائم تو یہی حال رہے گا

مشرق بھی نہیں علم و کمالات سے خالی
 مشرق ہی کے در پر کبھی مغرب تھا سوالی
 ہاں ایک ادا دیکھی ہے مغرب میں نرالی
 مجبور ہے مشرق کی جہاں ہمہستہ عالی
 یہ ایک ادا ناز ہے عورت کی لبت پر
 مشرق مراقتداں ہے اسی ایک ادا پر
 یہ فلسفہ یہ علم یہ حکمت یہ کمالات
 یہ فکر، یہ تدبیر یہ اعمال و خیالات
 یہ بحث یہ تمحیص، جوابات، سوالات
 یہ گولہ یہ بازو، ہلاکت کے یہ آلات
 صبح، جلال و غضب و طیش کی صورت
 ہر شام، جمال و طرب و عیش کی صورت

یہ قول و عمل ، ولولہ و عقل و فراست
 یہ ضبط یہ نظم اور یہ تدبیر یہ سیاست
 یہ شان یہ شوکت یہ تکلف یہ نفاست
 حاوی ہے ہر اک بات پہ اک حرفِ ریاست
 اس حرف میں ہر کام کی تحریک نہاں ہے
 پھر اس میں بھی اک نکتہ باریک نہاں ہے
 یہ نکتہ باریک ہے بے شک سبق آموز
 عرماں ہے اس آئینے میں اک شکلِ دل افروز
 مقصود ریاست کا ہے روشن صفت روز
 اس اثر میں خداں ہے عجب بے حق جہاں سوز
 یہ بے حق جہاں سوز ہے حُسنِ زنِ مغرب
 حُسنِ زنِ مغرب ہی سے ہے جو حُسنِ مغرب

بازار میں ہے گرمی بازار اسی سے
 آتے ہیں دکانوں میں خریدار اسی سے
 سودا ہے یہی چلتا ہے بیوپار اسی سے
 اشرفیوں کی جمیوں میں ہے کھنکار اسی سے
 ہر گھوپہ و برزن میں ہے تشہیر اسی کی
 دیکھی دور و دیوار پہ تصویر اسی کی
 مینانوں میں ہے رنگ نئے و جام اسی کا
 کس کا ہے لہو بادۂ گلفام — اسی کا
 تصویر کے پردے پہ بھی ہے کام اسی کا
 اخبار کے صفحوں میں بھی ہے نام اسی کا
 اور سازِ سیاست کی بھی دساز یہی ہے
 ظالم کبھی ہوتا نہیں جو راز یہی ہے

کہتے ہیں ترقی کی ہے بنیاد اسی پر
 ایجاد ہے یہ عالم ایجاد اسی پر
 ظاہر میں تو افراغ ہے آباد اسی پر
 باطن کو جو دیکھو تو ہے بیداد اسی پر
 عورت کو جوانی میں بناتے ہیں تماشا
 ٹوٹا جاتا جوانی تو سمجھ لیتے ہیں لاش
 مشرق میں جو زینت ہے پھپھانے کے لیے ہے
 مغرب میں مگر جلوہ دکھانے کے لیے ہے
 مشرق میں تو زن گھر ہی بسانے کے لیے ہے
 مغرب میں یہ جیپاری کمانے کے لیے ہے
 آزاد۔۔۔! سعادت کے سراخام کی خاطر
 مجبور ہے معصوم۔! ہر اک کام کی خاطر

تشریح بدن کرتی ہیں لسن کی دکانیں
 ہیرے کے یہ بازو ہیں، یہ پلّو کی رانیں
 پلکیں ہیں یہ تیر اور یہ ابرو ہیں کسانیں
 آئینوں میں آئینہ ہیں جو بن کی اٹھٹانیں
 یہ جلوہ مذمت نہ ستائش کے لیے ہے
 بیوپار کی خاطر ہے نیش کے لیے ہے
 بے جان نمونوں میں جو یہ رنگِ ادا ہے
 جاندار حینوں کا تو پھر ذکر ہی کیا ہے
 جس بُت پہ نظر ڈالے اک شانِ خدا ہے
 یہ شانِ خدا ہے تو بہت ہوشِ باہ ہے
 اللہ، جو یہ جلوہ نمائی ہے بُتوں کی
 تیری ہے خدائی، کہ خدائی ہے بُتوں کی

پیرس میں یہ انوار ہیں لندن سے زیادہ
 وہ حُسن ہے رنگین، یہاں حُسن ہے سادہ
 وہ رقص برہمنہ وہ اچھل کود، وہ بادہ
 ہر جوشِ نمائش میں نہاں ایک ارادہ
 یعنی کوئی ترکیب کوئی چال نکالو
 جیبوں سے مسافر کی زر و مال نکالو
 نہلاک ہیں یہ سب رہگذر و کوچہ و بازار
 ہر گام پہ صد فتنہ محشر ہے نمودار
 ایمان تو کیا جان کا بچنا بھی ہے دشوار
 آنکھوں سے بھی ہشیار ہو دل سے بھی خبردار
 اے دوست خطرناک ہے اُفتادِ نظر کی
 پھسلنا جو قدم خیر نہیں کا سہ سر کی

اس حُسن کے انبوہ قیامت کو تو دیکھو
 اس ناز و ادا و قد و قامت کو تو دیکھو
 میں دیکھ رہا ہوں مری شامت کو تو دیکھو
 ناوار مُسافر کی مذامت کو تو دیکھو
 خفّت وہ ملی ہے، کہ اُٹھائی نہیں جاتی
 دل خاک ملے، آنکھ ملائی نہیں جاتی
 دیکھی ہے عجب سیر سمندر کے کنارے
 تھے ریت کے ذرے فلک حُسن کے تارے
 وہ رنگ وہ خندہ وہ شرارت وہ اشاے
 شمشیر پہنہ کے نظر سوز منظر اے
 پانی میں مہکتی ہوئی سیاب کی موجیں
 اُور دھوپ میں خورشید جہان تاب کی موجیں

جل پریوں میں رقصاں تھے سیاں مرؤم آبی
 مستی وہ فضا میں تھی کہ منظر تھا گلابی
 صوفی تھے وہ سب ایک فقط میں تھا شرابی
 چاہی مری آنکھوں نے برے دل کی خرابی
 ساحل نہیں میرے لیے گرداب بلا ہوتا
 اللہ نے بچایا مجھے میں ڈوب چلا ہوتا
 اللہ رے ملبوس حسینان طر حدار
 عریاں بھی ہے مستور بھی ہر سادہ پرکار
 خلوت کدہ حسن و محبت ہیں چمن زار
 بیٹھے ہوئے لیٹے ہوئے خوابیدہ و بیدار
 گل آپ ہی سرشت ہوا جھوم رہے ہیں
 غنچے نگہ اہل رصنا چوم رہے ہیں

ڈھونڈے سے بھی ملتی نہیں آنکھوں کو پناہیں
 لڑتی ہیں سب راہ نگاہوں سے نگاہیں
 لیکن یہ تعجب ہے کہ اٹھتی نہیں آہیں
 چڑھتے ہیں نشے زیب کمر ہوتی ہیں باہیں
 اس جوشِ ملاقات میں حائل نہیں کوئی
 فرسودہ خیالات کا قائل نہیں کوئی
 کمزور دلائل کی پناہوں میں جوانی
 بے باک ہو سناک نگاہوں میں جوانی
 اٹھلائی ہوئی پھرتی ہے راہوں میں جوانی
 مشغول ہے معصوم گناہوں میں جوانی
 بجلی کی چمک خندہ گفتار سے پیدا
 شعلے کی لپک گرمی رفتار سے پیدا

قانون جہاں بر سر بیداد نہ آئے
 کیوں وصل سے ہر اہل ہوس شاد نہ آئے
 خود حسن پہ جب تک کوئی افتاد نہ آئے
 کوشش یہی ہوتی ہے خدا یاد نہ آئے
 مادر پدر آزاد سے کیا کام خدا کا
 مجبور ہی لیتے ہیں فقط نام خدا کا
 افرنک میں دراصل حسینوں کی ہی شاہی
 قبضے میں انہی کے ہے سفیدی و سیاہی
 ہوتی ہے انہی کے لیے اوروں کی تباہی
 فوجیں اسی خاطر، اسی خاطر ہیں سیاہی
 توپوں سے جو ہوتی ہے یہ اقوام کی خاطر
 اے حسن یہ ہے سب ترے آرام کی خاطر

خوش ہو مرے مشرق تری قسمت ہے نرالی
 مغرب کے لبوں پر ہے ترے خون کی لالی
 کالا ہے یہ چہرہ ، مری ہڈی نہیں کالی
 پس کر بھی مری خاک نہیں جھینپنے والی
 یہ باغ ہے میرے ہی لہو سے تر و تازہ
 ہے راکھ مری ہی رُخ افزنگ کا غازہ
 اب میرا سلام اے مرے اربابِ عنایات
 جاتا ہوں کہ مطلوبِ وطن میں مری خدمات
 رکنے کی اجازت نہیں دیتے مرے حالات
 اور یاد بھی ہیں شیخِ طریقت کی ہدایات
 شاعر کے لیے دُور کا دیدار ہی بس ہے
 نظارہ بڑی بات ہے باقی تو ہوس ہے

صحت کی خرابی نے بھی کچھ بات نہ باہی
 کچھ قلتِ زر سے بھی کوئی چیز نہ چاہی
 ماتم میں جوانی کے یہ گزری ہے چھ ماہی
 اس پر بھی گنہگار ہوں تو بہے الہی
 یہ دیدہ و دل تیرا کرم تیری عطا ہے
 پھر بھی نہیں تسکیں مجھے، میری ہی خطا ہے

محض ہر مجھ

(لندن کے ایک سٹوڈیو میں)

موقلم کی جنبشیں

یہ ہاتھ — رنگ رنگ کی گھلاوٹیں، سنوارتا نکھارتا ہوا

یہ سامنے نشست

اپنے گزشتہ حکم پہ دست بستہ ایک اجنبی

تیرے شاندار شہر میں ”نئی گھرنٹ“ کا یہ آدمی

کسی قدیم نسل اور وحشیانہ دور کا یہ فرد

میرے جگمگاتے قلب کی وطن کا شیر مرد

جس کے سر پہ ہے بندھا ہوا

پشاور کی بُنت کا ایک پارچہ

مٹے ہوئے سے رنگ کی کلاہ زرنکار پر

جہین نصف جس کے خم سے ہے ٹوٹھکی ہوئی

ٹٹکے ہوئے ہیں جس پہ دو سیاہ ابروؤں کے شاہکار

جیسے دریا ممتظر ہوں سب کار تیغ مانے آب دار

جن کے تحت تابدار و دُور بین و شعلہ ریز
 اک عقاب کی نگاہ ، بے پناہ و تیز و تیز
 اک نگاہ ، جس کی قہرانیوں کے سامنے
 کبھی تھے گزردہ یہ زمین و آسمان و مہر و ماہ
 اور یہ انگارہ برق پارہ
 یہ جمالِ رنگِ رُخ ، جلالِ آفتابِ ضوفشاں
 سیاہ ریش ، جس کے سایے میں
 حیاتِ تازہ کا دفینہ زیرِ سینہ ہے نہاں
 اور مصوری کا یہ ”سٹوڈیو“
 تیرا ”تعمیلِ جموش“
 جس میں آٹھ دس شنگ کے عوض
 تُو نے لا کے بھر لیا ہے
 ایشیا کے قلب کا خروش
 محض بہرِ مضحکہ ، محض بہرِ مضحکہ جسے
 جگا رہی ہیں بار بار
 تیرے موقلم کی جُبشیں — !

شکاری اور شکار

اے بسا اہل بیت آدم روتے ہست
رومی

شیروں سانپوں، شاہینوں، گھڑالوں اور رنگوں کی
 آزادی ۱۹۳۷ء میں لکھی گئی تھی دنیائے انسانی کی
 آج کیا صورتِ حال ہے؟ یہ ایک سوال ہے۔
 جس کا جواب شاید کوئی دوسرا شاعر لکھے؛

۱۹۵۸ء

شایروں کو آزادی ہے

شایروں کو آزادی ہے
 آزادی کے پابند رہیں
 جس کو چاہیں چسپیریں بھاڑیں
 کھائیں پسینے آئند رہیں

سانپوں کو آزادی ہے
 ہر بستے گھر میں بسنے کی
 ان کے سر میں زہر بھی ہے
 اور عادت بھی ہے ڈسنے کی

شاہیں کو آزادی ہے
 آزادی سے پرواز کرے
 ننھی ممتی چسپڑیوں پر
 جب چاہے مشق ناز کرے

پانی میں آزادی ہے
گھڑیلوں اور نہنگوں کو
جیسے جاہیں پالیں پسین
اپنی تندہ سنگوں کو

انساں نے بھی شوخی سیکھی
وحشت کے ان رنگوں سے
شیروں، سانپوں، شاہینوں
گھڑیلوں اور نہنگوں سے

انساں بھی کچھ شہید ہیں
باقی بھیڑوں کی آبادی ہے
بھیڑیں سب پابند ہیں
لیکن شیروں کو آزادی ہے

شیر کے آگے بھیڑیں کیا ہیں
 اک من بھاتا کھا جا ہے
 باقی ساری دنیا پر جا
 شیر اکیلا راجا ہے

بھیڑیں لا تعداد ہیں لیکن
 سب کو جان کے لالے ہیں
 اُن کو یہ تسلیم ملی ہے
 بھیڑیے طاقت والے ہیں

ماس بھی کھائیں کھال بھی نوچیں
 ہر دم لاگو حبانوں کے
 بھیڑیں کاٹیں دوہرے غلامی
 بل پر گلہ بانوں کے

شیر ہیں دعویٰ دار کہ ہم سے
امن ہے اس آبادی کا
بھیڑیں جب تک شیر نہ بن لیں
نام نہ لیں آزادی کا

انسانوں میں سانپ بہت ہیں
قاتل بھی زہریلے بھی
ان سے بچنا مشکل ہے
آزاد بھی ہیں پھرتیلے بھی

سانپ تو بننا مشکل ہے
اس خصلت سے معذور ہیں ہم
منتر جاننے والوں کی ،
محتاجی پر مجبور ہیں ہم

شاہیں بھی ہیں چڑیاں بھی ہیں
 انسانوں کی بستی میں
 ان کو ناز بلندی پر
 یہ نالاں اپنی پستی میں

شاہیں کو تادیب کرو
 یا چپڑیوں کو شاہیں کرو
 یوں اس باغِ عالم میں
 آزادی کی نعمتیں کرو

بحرِ جہاں میں طغیانِ ہر و نہاں
 انسانی گھسٹریاں بھی ہیں
 طالبِ جان و جسم بھی ہیں
 شیدائے حباب و مال بھی ہیں

پیٹ پھٹے پڑتے ہیں ان کے
 یمنہ بھاڑے بیٹھے ہیں
 ہر بازار میں ہر سٹدی میں
 جھنڈے گاڑے بیٹھے ہیں

ان کی بستی سے بستی ہے
 بستی قبرستانوں کی
 ان کی توندیں قبریں ہیں
 انسان کے ارمانوں کی

مزدوری کا تذکرہ چھوڑو
 سرمائے کا فکر کرو
 خون کی اک اک بوٹہ نچوڑو
 ان کے پیٹ کی فکر کرو

جہاں کہاں ہر سمت کھلے ہیں
 مُنہ سرمایہ داروں کے
 ان کے مُنہ میں دانت نہیں
 پھل ہیں خونی تلواروں کے

کھا جانے کا کون سا گڑ ہے
 جو ان سب کو یاد نہیں
 جب تک ان کو آزادی ہے
 کوئی بھی آزاد نہیں

زر کا بسندہ جتنا چاہے
 عقل و حسد پر ناز کرے
 مٹی میں دھنس جائے
 یا بالائے خاک پرواز کرے

اس کی آزادی کی باتیں
 ساری جھوٹی باتیں ہیں
 کھا جانے کی ترکیبیں ہیں
 پی جانے کی گستاخیاں ہیں

جب تک ایسے جانوروں کا
 ڈر دنیا پر غالب ہے
 پہلے مجھ سے بات کرے
 جو آزادی کا طالب ہے

عزمِ آدم

بن کے بیٹھے ہیں یہ مغرور یہاں صاحبِ تاج
دیوتاؤں سے بشر کو ابھی لینا ہے حُسنِ راج

السد، السد، السد لے جذبہٴ دُشوار پسند
قلۂ کوہ ذرا اور بلند اور بلند

باد و باران سے کہو جوشِ جوانی دکھلائیں
طبعِ حاضر ہو تو کچھ اپنی روانی دکھلائیں

سریہ ہر ایک بلا آئے دمِ سربازی
زالہ کیا باہم فلک سے ہو کلونِ اندازی

آسمانوں سے ہو بیخ بستہ چٹانوں کا نزل
 سر دھری بھی یہ منظور، یہ سختی بھی مقبول
 اٹڈے سیلاب کہ طوفان قیامت توڑے
 اُس پہ لعنت ہے جو منہ راہ طلبے موڑے
 ہم اولوالعزم ہیں، پیچھے نہیں ہٹنے والے
 اودھوں گے کوئی رستے سے پھٹنے والے
 ہٹ گئے ہم تو یہ کلام اور بشر کر لیں گے
 کوہ کیا چیز ہیں، اسلاک کو سر کر لیں گے
 بن کے بیٹھے ہیں جو مغرور بیاں صاحب تاج
 دیوتاؤں سے بشر کو ابھی لینا ہے حناج

دیوانہ بکار

ابم ہوش آیا، حال زمانہ اب معلوم ہوا
سب فرزائے، میں دیوانہ اب معلوم ہوا

شعر کی تعریف میں یہ شرط بیان کی گئی ہے کہ اس کے

موزوں ہونے میں شاعر کا ارادہ ضرور شامل ہو

(دورانِ سیاحت کثیر) ۲۱ اگست اور یکم ستمبر ۳۹ء

کی درمیانی شب یہ نظم کاغذ پر لائے ہوئے میں اسی شرط

کا پابند نہیں تھا — لہذا ممکن ہوں کہ یہ فقط دلیانے

کی ہنسی ہے، یعنی بے معنی — دوسری جگہ عظیم اُرد

اس کے بعد اُرد حالات کے سبب — میرے بہت سے

سخن سچ احباب کو اس میں مسمیٰ ہی معنی نظر آئے۔ مجھے اس نظم

کے بارے میں اُن کی سخن فنی پر جس نطن کا شک ہے —

اب خوب ہنسنے گا دیوانہ

(۱)

گرم جوشی

اب سورج سر پر آدھلے گا

ٹھنڈا لوبا چمکے گا

اور دھوپ جواں ہو جائے گی

سٹھیانے ہوئے مندرائوں پر

اب زلیت گراں ہو جائے گی

ہر اصل عمیاں ہو جائے گی

اب خوب ہنسنے گا دیوانہ

اب آگ بگولے ناچیں گے
 سب لنگڑے لولے ناچیں گے
 گرداب بلا بن جائیں گے
 روندی ہوئی مٹی کے ذرے
 طوفان سپا بن جائیں گے
 صحرا دریا بن جائیں گے

اب خوب ہنسے گا دیوانہ

اب سستی جال بچھائے گی
 اب دھونس نہ چلنے پائے گی
 مزدوروں اور کسانوں پر
 اب سوکھا خون نچوڑنے والے
 روئیں گے نقصانوں پر
 ان کھیتوں ان کھلیانوں پر

اب خوب ہنسے گا دیوانہ

اب پیل دھات کی بیماری
 پھیل نہ سکیں گے بیوپاری
 لوہے کا لوہا مانیں گے
 سونے کی گمبہی کاؤں میں
 سو جانا بستر جانیں گے
 درود کی خاک نہ چھانیں گے
 اب خوب منہے گا دیوانہ

اب خون کے سگر کھولیں گے
 انسان کے جوہر کھولیں گے
 چڑھ جائے گی تپ صحراؤں کو
 اُٹھے گی اُٹ کر لال آندھی
 پی جائے گی دریاؤں کو
 باندھے گا شند ہواؤں کو
 اب خوب منہے گا دیوانہ

ہر زلفت سے بچھڑ لکیں گے
آنکھوں سے شرارے ٹپکیں گے

صیادوں حسن شکاروں پر
غصتے کا پسینہ چھوٹے گا

موتی بنکر رُخساروں پر

اس دھوپ میں چاند تاروں پر

اب خوب سننے کا دیوانہ

اب مُودھ نہ دیں گی بھینیں گائیں

اُن اُن کرنے لگیں گی مائیں

بچے مُم مُم چھینیں گے

اَب اونگھنے والے نکستہ شوہر

”عقل مجسم“ چھینیں گے

سب رِہم رِہم چھینیں گے

اب خوب سننے کا دیوانہ

اب خانقہوں کی مُردہ اُداسی
 روزِ ازل کی بھوکِ پیاسی
 جھومے گی مے خانوں پر
 اب ساقی، منجھے سپرِ میناں
 بیچیں گے وعظِ دکانوں پر
 ان زہر بھرے پیالوں پر
 اب خوب ہنسے گا دیوانہ

زورِ آوری سے کمزروں کی
 اب جیب کٹے گی چوروں کی
 اور منڈی ساہوکاروں کی
 اک بھوکِ ہر حق "سیر کرے گی
 منڈیوں اور بازاروں کی
 گت دیکھ کے دُنیا داروں کی
 اب خوب ہنسے گا دیوانہ

جینا ، دل گر وہ ڈھونڈے گا

ہر زندہ "مردہ" ڈھونڈے گا

کوئی کونا کھڈراتے خانہ

اب ہر جنگل میں منگل ہو گا

ہر بستی میں ویرانہ

اک نعرہ لگا کر مستانہ

اب خوب ہنسے گا دیوانہ

اب خوب ہنسے گا دیوانہ

(۲)

سرودھری

اب جاڑا جھنڈے گاڑے گا

اور فیل فلک چنگھاڑے گا

اب بادل شور مچائیں گے

اب بھوت فلک پر چڑھ دوڑیں گے

دھرتی کو دھلائیں گے

ہنسنے کے مزے اب آئیں گے

اب خوب ہنسے گا دیوانہ

آویان کریں گے بجائیں بجائیں
 چھوٹس کی جھونپڑیوں میں ہوائیں
 سائیں سائیں گونجیں گی
 اس گونج میں ہجو کے سنگوں کی
 سنان صدائیں گونجیں گی
 ویران سرائیں گونجیں گی

اب خوب ہنسنے کا دیوانہ

اب بجلی کے کوڑوں سے ہوا
 شمشیر کعب، زنجیر بہ پا
 لوہے کے رتھوں کو ہانکے گی
 ایک ایک دھوئیں کے محل سے
 ضدِ حق کی ملکہ جھانکے گی
 اب آگ انگارے پھانکے گی

اب خوب ہنسنے کا دیوانہ

اب ٹھنڈی آہوں کے پرنا لے

پالے، آفت کے پر کا لے

کندے تو لے برسیں گے

اب آہن ٹھنڈا پڑ جائے گا

آہن کے گو لے برسیں گے

ہر سر پر او لے برسیں گے

اب خوب ہنسے گا دیوانہ

تخریب کی توپیں چھوٹیں گی

تعمیر کی کلبیاں چھوٹیں گی

ہر گورستان شاہی میں

بالائے ہوا، زیرِ دریا

غل ہوگا مرغ و ماہی میں

اس نو آبادتِ بے ہی میں

اب خوب ہنسے گا دیوانہ

اب ناگن بائیں گے گمائے گی
 سانپ کی لالی لہرائے گی
 کالے آتش دانوں میں
 دانا بیاں کینچلی بدلیں گی
 شہروں کے بندہ خانوں میں
 اور دور کھلے میدانوں میں
 اب خوب سنئے گا دیوانہ

بھس خالی پیٹ میں بھر نہ سکے گا
 کوئی تجارت کر نہ سکے گا
 ٹکڑی ٹکڑی کھالوں کی
 اب منڈھ بھی جائے تو بچ نہ سکے گی
 نوبت پیسے والوں کی
 بے کاری پر دلاؤں کی
 اب خوب سنئے گا دیوانہ

اب دال نہ جاگیروں کی گلے گی
 آگ مگر دن رات جلے گی
 چمڑے کے تنوروں میں
 اب کال پڑے گا غلے کا
 بیوپاریوں بے مقدوروں میں
 اور سیٹ بھرے مزدوروں میں
 اب خوب ہنسنے کا دیوانہ

اب گاڑھا پسینہ ہنسنے والے
 اور ٹھے پھریں گے شال دوشالے
 مُفت نہ جھولیں جھولیں گی
 پھولے ہوئے گال اب پھکیں گے
 پچکی ہوئی تو ندیں جھولیں گی
 سب عقلیں چو کڑی جھولیں گی
 اب خوب ہنسنے کا دیوانہ

کدھر جاتا ہے دیوانے !

بہت سی بستیاں ہیں محشرِ ستاں سرود لاشوں کے

طلسمی کارخانے چلتی پھرتی زرد لاشوں کے

بہت سی وادیوں میں رنگِ مستی ننگِ مستی ہے

جہاں اُفتاد ہی اُفتاد ہے پستی ہی پستی ہے

بہت سی محفلیں ہیں بے زبانی کے عزاخانے

جہاں بے چارگی کہتی ہے محرومی کے افسانے

بہت سی خدوئوں میں جُرم ہے اقدامِ سرگوشی

مسلسل ایک سناٹا مسلسل ایک خاموشی

بہت سے دل ہیں جن میں کوئی کروٹ نہیں اُٹھائی

بہت آنکھیں ہیں اب تک جن میں سینائی نہیں آئی

یہ لاتعداد فزائے ہیں غمِ آباد ویرانے

بہت سا کام باقی ہے کدھر جاتا ہے دیوانے

تلخیص شیریں

رُومان و عرفان

فغاں کنڈریں لا جُوری قفس چمن بلبے را گرفت نفس
 درینا کہ در صحنِ این کند باغ چه آوائے مری چه غوغائے زانغ
 چشند یا وہ یا وہ گویاں بلبند اُمیدی لب از محنت سنجی بلبند

خدیج سحر چوں بر آرد خوش
 چا بلبِ بل مست گردد ہمیش

اُمیدی رازی

نعت تصویر

شورشِ بہتی کا ہنگامہ ہے میرے سامنے
کشمکش کا محشر برپا ہے میرے سامنے
اک طرف آ رہی ہے شادیانوں کی صدا
اک طرف فریاد ہے، غوغا ہے میرے سامنے

ساحلِ محنتِ خزان و پائے لگاتار خارزار
رنگِ سرمایہ گل اندر گل بہار اندر بہار
سنگون و زار و نالائ، عاجزیِ مزدور کی
سرفراز و شاد و خنداںِ نخوتِ سرمایہ دار

ہاں یہ سب کچھ ہے مگر مجھ پر اثر کچھ بھی نہیں
 سب اذیت جسم پر ہے رُوح پر کچھ بھی نہیں
 زلزلے آئے تہ و بالا ہوا نظمِ جہاں
 میری دُنیا نے سکوں زیرِ کُچھ بھی نہیں

میں کسی بے استغنائی پر بھی افسردہ نہیں
 دوستوں کی بے وفائی پر بھی آزرہ نہیں
 جب یہ حالت ہو گئی ہو قوتِ احساس کی
 پھر یہ کیسے مان لوں زندہ ہوں میں مُردہ نہیں

اب یہ ذکرِ جام و بادہ گردشِ تقدیر ہے
 فکرِ رنگیں ہو کہ سادہ، شعرِ بے تاثیر ہے
 ہاں یہی نقاشیِ فطرت ہے جو بے رنگ ہے
 ہاں اسی عالم کا غنم، نغمہِ تصویر ہے

ڈھونڈ کر لاؤں کوئی ایسا مُصَوِّر باکمال
جو مری آنکھوں میں کھینچے میری ہی تصویرِ حال
مُوتِ سلم کی ٹھوکروں سے کام لے مضراب کا
جس سے آخرِ چنچ چنچ اُٹھے ہر اسانہ خیال

زندگی کا ساز چھیڑوں پھر نئے انداز سے
جس سے رُوحِ دزد ہو بیدار خوابِ ناز سے
جاگ اُٹھے پھر مرے گونجے ہوئے نغمے کی گونج
راکھ میں شعلے بھڑک اٹھیں مری آواز سے

نعرۂ تنکبیر

دیکھ اُفتی پر ہے ہریدا، صبح صادق کا سپیدا
 سُرخ، نیلے، کالے، پیلے بادلوں کو چیر کر
 چھا رہی ہے پھر اُسی خورشید کی تابندگی
 جس سے پیدا ہے ازل سے تا ابد، نورِ اللہ الصمد
 مشرق و مغرب کی واحد زندگی
 تفرقوں کے دشت میں کھوئے ہوئے سب کارواں
 ہو رہے ہیں ہم رکاب و ہم عنان

اے بہانہ باز، حیلہ ساز، انبوه فراری
 اختیاری ذلت و خواری پر کب تک فخر و ناز !
 دیکھ ابنائے زمانہ، چل رہے ہیں کس طرح شانہ بشانہ
 دیکھ، اعجازِ اخوت

کثرتِ انسان کی وحدتِ خیز قوت
 سرفرازی، سروری کا پاگئی ہے راستہ
 ہو رہی ہیں پھر صفیں آراستہ
 منزلِ مقصود، اب نہیں ناہود

میری جوانی

دُر دے ہے لبر ز پیالہ ہو گیا بے کیفی کا ازالہ
 میرا قُسلِ حشوشی ٹوٹا قید سے چھوٹے نغمہ مالہ
 اب کی مرتبہ اک طالع کو سو جھانپے مضنون نرالا
 میری جوانی کے منصوبے پوچھ رہا ہے پوچھنے والا
 مقصد یہ ہے اپنی بستی جگ کو پھر اک بار سناؤں
 میں یہ دُکھڑے رو تو چُکا ہوں کیوں نہ کلام اپنا دہراؤں
 میری جوانی کے منصوبے میرا سخن میری تحریریں
 میرے ارادوں کے افانے میری حسرت کی تصویریں
 تو یہ سمجھائیں نے شاید لطف کی بات چُھا رکھی ہے
 آنسوؤں کی تلخی کے سوا بھی اور کوئی لذت چکھی ہے

اک بدست جوانی ہوگی
دریا میں طغیانی ہوگی

تو یہ سجھامیری جوانی
رندی کا اک دریا ہوگا

بھاری بھاری مٹکے ہوں گے
زاہدوں کے منہ لٹکے ہوں گے

اک نئے خانہ ہوگا جس میں
دیکھ کے میری بادہ پرستی

ناچ رنگ کی محفل ہوگی
کوئی حور شمال ہوگی

تو یہ سجھامیری تسکیں
اور اس منصوبے کی تہ میں

میرا آنا حبابا ہوگا
مطرب سے یا رانہ ہوگا

حسن کی سنڈی میں بھی شاید
رقاصہ کی چاہت ہوگی

میرے خوابوں کی محبوبہ
میری جوانی کا منصوبہ

کوئی ایک پری بھی ہوگی
جس کو اڑا کر لایا ہوگا

میں نے ڈالے ہوں گے ڈورے
اُس کے بازو گورے گورے

یا اک حسن راہ گز پر
میری بھونڈی گردن ہوگی

یہ افسانے گھڑ کے سناؤں
ہڈی بوڑھوں کی گرماؤں

تیری منشا یہ ہے میں بھی
لڑکوں کو ترغیب گنہوں

کچھ بھی نہیں حبِ نفس پرستی
ہلکے شاعرِ شہرت سستی

تو سچا ہے تو نے دیکھا
جس کے بیاں سے پالیتے ہیں

جو بن پئے نہ رہ سکتا ہو
مُنہ سے حرف نہ کہہ سکتا ہو

ڈھونڈ لے کوئی رنگیں شاعر
آگ نہ جب تک پیٹ میں اترے

ناموسِ اشراف کے حق میں
پاجی شاعر یا احسن میں

جس کے مُنہ کا حرف سوجھ گالی
جس کو سُن کر فسق نہ سوجھے

عاجز اور نا اہل ہونے سے
نام اچھالے مسخِ زین سے

اہلِ نظر سے آنکھ چُرائے
نافموں کی بزم میں جائے

سر کو ہلائے، نشے میں ٹھوٹے
سر مائے کی چو پھٹ چڑھے

قہقروں کو تحسین سمجھ لے
محنت کا حامی کھلائے

خون پیتے مزدور کا دن کو
جس کی جوانی کا منصوبہ

رات کوئی مزدور فی تا کے
اکثر پلٹے جوتے کھا کے

اپنے بیوی بچے تاج کر
جس محفل جس بزم میں پہنچے

چوک میں گھومے بن کر چھپلا
منہ سے نکلے لائے لائے

فرش سے اُچھلے ذکرِ حنا پر
خبطی ہے یہ سہ کوئی سمجھے

عرش پہ چھپٹے گھونسا تانے
چاہتا کیا ہے کوئی نہ جانے

جس کے شعر میں ہو بے رطبی
جس کی منزل ہو بد راہی

جس کے مضمون ہوں بازاری
جس کا مقصد ہو بد کاری

اپنی ملت کا ہو دشمن
طعن کرے پاکانِ سلف پر

گانٹھے غیروں سے یارانہ
بہرِ حصولِ آب و دانہ

باہر سے ابلہ نظر آئے
دکھلائے ہر کھیل مداری

اندر سے ہو پکا شاطر
اپنے پانی پیٹ کی خاطر

ایسا شاعر ڈھونڈ لے پایا ہے
اس کی جوانی کے منصوبے
اس سے رونق محسوس ہوگی
سن کر دنیا خوش دل ہوگی

جس سک پر میں ہوں اس میں
میری جوانی کے قصے میں
رندی کو ترجیح نہیں ہے
سامانِ قنبر ترجیح نہیں ہے

میری جوانی ہندوستانی
قوم و وطن کے درد میں شامل
بے چاری محسوس ہو جوانی
آزادی سے دور جوانی

میری جوانی نے بھی دیکھے
شرم نے لیکن پھیر لیں آنکھیں
جوشِ ہوس کے یہ نظارے
ہوتے رہے گو لاکھ اشارے

میری جوانی کے منصوبے
جب میں جاں تھا میرے رہبر
شیدائے تحصیل ہنر تھے
اہلِ دل تھے اہلِ نظر تھے

جب بھی اکثر ہم محروم سے
یعنی شرمِ خلق تھی مجھ کو
میرا نصب العین حبِ اہل تھا
یعنی مجھ کو خوفِ حبِ اہل تھا

کیا ہوں میں — ؟

یہ خیالاتِ عظیم
 کیا ہوں میں ؟
 دریاں قعرِ دریا
 اک میتیم !
 ایک تنہا درد
 ایک اشکِ گرم
 ایک آہِ سرد
 خونِ انسانی کے ایسے قلمِ ذخار میں
 تھلکوں میں ، زلزلوں میں
 صاعقوں میں
 اک نوائے بے نوا
 کوئی بھی سنتا نہیں
 اے میرے ربِ کریم
 کیا ہے یہ اُمیدِ بوم
 یہ خیالاتِ عظیم
 کیا ہوں میں ؟

میرا کلام بہترین

آج کل میرے کلام بہترین کی ہے تلاش
 آپ بیتی آپ کو اپنی سنا سکتائیں گاش
 اک طرف منکرِ سخن تھی اک طرف فکرِ معاش
 اس تضادِ دم سے ہوا تھا شیشہٴ دل پاش پاش

عرش پر گونجی تھی اُس دم ایک آوازِ حریف
 تھی یہ آوازِ حریف

میرا کلام بہترین

مَدّتوں جنسِ سخن کے بیچنے پر ہست مدار
 میری مزدوری چکاتے تھے برے سرمایہ دار
 کوڑیوں میں رولتے تھے جب وہ موتی بار بار
 دید کے قابل ہوا کرتے تھے میرے شاہکار

خندہ آتا تھا برے لب پر، مگر اندوگہیں
 خندہ اندوگہیں

میرا کلام بہترین

شعر کا دامن گزروں سے ناپتے تھے بے شعور
 پھر سیاہی بن کے ڈھلتا تھا میری آنکھوں کا نور
 بعد ازاں ہوتی تھی میری ماضی اُن کے حضور
 سرد مہری دھیتی تھی گرمی چشمِ سنیر

پانی پانی ہو کے بہ جاتی تھی آہِ واپس
 میری آہِ آتشیں

میرا کلام بہترین

میرے دم سے جن دنوں روشنی تھی ہر زبم سخن
 شمع کہ کہہ کر جلاتی تھی مجھے ہر آنجن
 میری بولی بولتے تھے ہم صنیراں چین
 پھر ہر بازار کرتے تھے فرود ما دمن

تھامے نخلِ ہنر سے خرمن ہر خوشہ چیں

خرمن ہر خوشہ چیں

میرا کلام بہترین

اس زالی گرم بازاری سے میں تنگ آگیا
 عارضِ عرضِ سخن پر اک نیا رنگ آگیا
 میرے ہاتھ اک اور ساز اک اور آہنگ آگیا
 کچھ نہ کہنے سفتے رہنے کا مجھے ڈھنگ آگیا

اب اڑائی جا نہیں سکتی یہ طرزِ دل نشیں

ہے یہ طرزِ دل نشیں

میرا کلام بہترین

خاموشی میرے سخن کا ایک نیا انداز ہے
 اس نئے انداز پر تخلیقِ فن کو ناز ہے
 یہ عجب نیزنگ ہے جو سرسبز اعجاز ہے
 یہ عجب آہنگ ہے جو بے نیاز ساز ہے

صورتِ بے حرف ہے اور معنی و جدا آفریں

معنی و جدا آفریں

میرا کلام بہتر ہے

اب چراغِ اپنا تر و امنِ حبِ لایا ہوں میں
 جب بھی تنہائی طے محفلِ حبِ لیتا ہوں میں
 نعمتِ دلِ ہی دل میں گنگن لیتا ہوں میں
 دلِ ہی دل میں قص کر لیتا ہوں گالیتا ہوں میں

یہ کلام بہتر ہے اب لب تک آتا ہی نہیں

لب تک آتا ہی نہیں

میرا کلام بہتر ہے

ہر ستارا اکیلیت میں ہے آپ اپنی مثال
 ہر گل رنگیں بجائے خود ہے دنیائے کمال
 اے کہ تیرے لب پر ہے "قدرا فادی" کا سول
 دیکھ میرے آنسوؤں کا رنگ داغوں کا جمال

ہے کلام بہترین میرا نمایاں ہے کہیں
 ہے نمایاں ہے کہیں

میرا کلام بہترین

بکوشید—!

مقامی بن کے آیا ہے نہ راہی بن کے آیا ہے
یہ دنیا رزم گہ ہے تو سپاہی بن کے آیا ہے

ترے شایاں نہ دنیا دار کا جامہ نہ زاحم کا
بلا ہے درگاہ حق سے تجھے عہدہ مجاہد کا

تجھے فرصت کہاں ہے مجناؤ نوش ہونے کی
گھڑی سر پر گھڑی ہے اب کفن بردوش ہونے کی

مری شاعری ہے نظاروں کی دُنیا

یہ غنیمت سراجِ تباروں کی دُنیا
 یہ ہنگامہ زرا آبشاروں کی دُنیا
 فلک آشنا کوہساروں کی دُنیا
 یہ بچوں کی بستی، بہاروں کی دُنیا
 یہی ہے مرے شاہکاروں کی دُنیا
 مری شاعری ہے نظاروں کی دُنیا

میری شاعری چاند تاروں کی دُنب

یہ رنگیں گھس دندا، طسہم زمانہ
 کھلونوں کا ہے اک بڑا کارخانہ
 ہوا باندھنا اور غبار سے بنانا
 غبار سے بنا کر فضا میں اُڑانا
 میرے شعر کا شعبہ ہے پرانا

میری شاعری چاند تاروں کی دُنب

میری شاعری بخت یاروں کی دُنب

فلک شامیانہ ہے، پرست قیاتیں
 اسی اوٹ میں دیدہ و دل کی گھاتیں
 ہجومِ تنہا، خوشی کی براتیں
 جوانی کے دن، کامرانی کی راتیں
 میرے شعر کی یہ بھی وار داتیں

میری شاعری بخت یاروں کی دُنب

بری شاعری خارزاروں کی دُنیا

تھی دستی و پستی و خستہ حالی
 گبولوں سے معمور بھولوں سے خالی
 وہ بیشہ کہ ہے مزرع خشک سالی
 جہاں اُتر بھولا ہے دریا نوالی
 نہ بھولی اُسے بھی بری منکرِ عالی

بری شاعری خارزاروں کی دُنیا

بری شاعری شہسواروں کی دُنیا

بہادر، حبسی، سُورما اور جیالے
 قضا جن کی ڈھالیں، قدِ جن کے بھالے
 تہور کے گھوڑوں کی باگیں سنبھالے
 چلے ہیں سوتے رزمگہ عزم والے
 برے شعر ہیں غازیوں کے رسالے

بری شاعروں شہسواروں کی دُنیا

مری شاعری دل نگاروں کی دُنی

یہ فریادِ خاموش نیچی رنگا ہیں
یہ ارماں کہ مسدود ہیں جن کی راہیں
ذیب و فاسے کہاں تک بنا ہیں
برے دیدہ و دل ہیں ان کی پناہیں
برے شعر آفسو مرے شعر آہیں

مری شاعری دل نگاروں کی دُنی

مری شاعری بے قراروں کی دُنی

وہ ذرہ کہ راہِ سکوں میں مُغل ہے
وہ قطرہ کہ صد آتشِ مشتعل ہے
وہ دیدہ کہ بیداریِ مُستقل ہے
وہ دل جس سے دل گئی آبِ گل ہے
برے شعر میں بھی وہی ایک دل ہے

مری شاعری بے قراروں کی دُنی

ہری شاعری خاکساروں کی دُنیا

بسیرا خس و خوار و خاشاک پر ہے
مگر ہاتھ ہر خوشتر تاک پر ہے
اگرچہ سہر بے خودی خاک پر ہے
دماغ خودی اوجِ منسلاک پر ہے
ہرے شعر کی آنکھ ادراک پر ہے

ہری شاعری خاکساروں کی دُنیا

ہری شاعری بادہ خواروں کی دُنیا

چلے جامِ جم بھی، جھے بزم کے بھی
مگر ساقیا دیکھ اک اور شے بھی
یہ فریاد میری کہ ہے جس میں لے بھی
یہ نالہ مرا جو ہے پابند نے بھی
مرا شعر شیشہ بھی، نشہ بھی مے بھی

ہری شاعری بادہ خواروں کی دُنیا

میری شاعری دوستداروں کی دُنیا

یہ دُنیا جہاں سے الگ لاک جہاں ہے
 یہاں دل نوازی کا بسکتہ رواں ہے
 یہاں آسماں ہے مگر مہرباں ہے
 نہ جانے عداوت کی دُنیا کہاں ہے
 ہر اشعر احسان کا تر جہاں ہے

میری شاعری دوستداروں کی دُنیا

میری شاعری غمگساروں کی دُنیا

فلک مہر پرور زمین متہم ہیں ہے
 نہ وہ سرور مہر اور نہ یہ گرم کہیں ہے
 فلک بھی حسین ہے زمین بھی حسین ہے
 وہ نورِ آفریں یہ ظہورِ آفریں ہے
 مرے آئنے میں کدورت نہیں ہے

میری شاعری غمگساروں کی دُنیا

مری شاعری میرے پیاروں کی دُنیا

وہ پیارے کہ سوتے عدم جا چکے ہیں
وہ کلیاں وہ غنچے جو مَرَحبا چکے ہیں
ترانے جو آرام مند ما چکے ہیں
خزانے جنہیں لوگ دفنا چکے ہیں
مرے شعر میں زندگی پا چکے ہیں

مری شاعری میرے پیاروں کی دُنیا

مری شاعری انتظاروں کی دُنیا

کبھی میں بھی ہو جاؤں آزاد شاید
اسیری کی گھٹ جائے میعاد شاید
سنی جائے اک روز نیا دُشاید
وہ بھولے سے کر لے مجھے یاد شاید
وہاں کام آئے یہ رُوداد شاید

مری شاعری انتظاروں کی دُنیا

مری شاعری ہے اشاروں کی دُنیا

فلک پر ہیں گردش میں چاند اور تارے
 زمیں پر ہیں بار و جزاں کے نظارے
 برابر چلے جا رہے ہیں جہاں پر
 کہ ذوقِ غنیمت مے رہا ہے سہارے
 مگر کون سمجھے یہ نازک اشارے

مری شاعری ہے اشاروں کی دُنیا

یارانِ تیز گام

نے منزل کو جا لیا

مثالِ گردِ میری خاک بھی گرمِ تعاقب ہے
کہ اترے گا کہیں تو شہسوارِ ناز تو سن سے

وفات کی برات

رُوحِ مجروح، تنِ بدی مہنش
 واہ وا، کیا حیات پائی ہے
 اُبھرِ راحت کا جس پہ سایہ ہو
 دن ملا ہے نہ رات پائی ہے
 حوصلے تھے بہت مگر سب نے
 رفتہ رفتہ وفات پائی ہے
 تابِ نفلتِ ارہ پائی ہے لیکن
 قیدی ششِ جہات پائی ہے

کائنات اپنی جاننا ہوں میں
 بس یہی کائنات پائی ہے

وادیِ آشکِ آفریں ہے جہاں
 بارشِ واردات پائی ہے
 پاچکا ہوں وہ درِ دل جس نے
 مجھ میں بھی کوئی بات پائی ہے
 یاد ہے جس کو دوست کا احساں
 ایک اپنی ہی ذات پائی ہے
 غم نہیں ہے کہ موت سے میں نے
 راحتِ التفات پائی ہے
 اے خوشا یہ شکستِ کعبہ دل
 دولتِ سومنات پائی ہے
 بل گیا ہے نشانِ منزلِ دوست
 جھنجھو سے مخبات پائی ہے
 یہ شبِ زندگی ہے صبحِ مراد
 تیرگی میں برات پائی ہے

آغا حشر

حشر کا بھی کام پورا ہو گیا
 لو یہ ہنسنگامہ بھی آخر سو گیا
 اور اک روشن ستارہ ٹوٹ کر
 رات کی تاریکیوں میں کھو گیا

ختم ہوتی جا رہی ہے زندگی
 موت کو شرماتا رہی ہے زندگی
 ہے اگر مرنا بھی جینے ہی کا نام
 زندگی کو کھا رہی ہے زندگی

کس قدر آباد ہے دُنیا کے دُوں
 مُردہ و افسردہ و خوار و زبوں
 خاک کا پیوند ہونے کے لیے
 صورتِ اشکِ ندامت سرنگوں

اہلِ دل کی زندگی ہے زندگی
 رُوح کی تابندگی ہے زندگی
 ہر گئے رخصت جہاں نور و سرور
 کچھ نہیں شرمندگی ہے زندگی

حیف وہ آنکھیں جو مئے خانہ نہیں
 خاک اُس دل پر جو تپانہ نہیں
 موت ہے نشہ اُتر جانے کا نام
 زندگی جُبدِ رقصِ مستانہ نہیں

حشر تھا ہنسنا تمہارے عیش و نشاط
اک تلامذہ غیب سے موج انبساط
آسمانوں کو تیرا بالا کرے
اے خدا، اک آدمی کی یہ بساط

عاقلی منہ زانگی کی بات ہے
عاشقی دیوانگی کی بات ہے
عاقلی اس پر مسلسل عاشقی
واقعی مردانگی کی بات ہے

کون ہے جو حشر کا ہو جانشین،
عرش ہو جس کے تختہ پل کی زمیں
غیر زن ہو گنبد افلاک پر
ہے کوئی ایسا؟ نہیں کوئی نہیں

کون عاقل ہے جو دیوانہ بنے
 غمکدے میں غم سے بیگانہ بنے
 زندگی جس کی حقیقت ہو حفیظ
 اور مرجائے تو افسانہ بنے

مُرسیدِ راسِ مسعود

یہ بہت وضعیت ہے "ہے اور نہیں" یہ بُرد و نبود
 خدا ہی جانے خدا کو ہے اس سے کیا مقصود
 نہاں ترغیمِ لبِ لبَل میں نالہِ ماتم ،
 عیاں تبسمِ گل سے ہے چشمِ اشکِ اَلود
 کمالِ عقلِ جہالت ، مائلِ عشقِ حبسوں
 مثالِ حُسن ہے شعلہ ، زوالِ شعلہ ہے دُود
 "زمانہ جامِ بدست و جنازہ بردوشِ است"
 اسی کا نام ہے دُنیا ، یہی ہے بزمِ شہود

گناہگار ہوں بے شک اُس ایک ساعت کا
 کہ اک نظارۂ دل کش سے رُوح تھی خوشنود
 دو جلوئے مجھ کو نظر آئے ایک صورت میں
 وہ عشق و عقل کہ دُنیائے آج ہیں مفقود
 وہ جس کی ذات سے زندہ تھا عشق سرسید
 وہ جس کی بات میں تمام تھی دانش محسود
 وہ اک نمونہ احسان و پیکر ایثار
 جیسے نہ ذوقِ مناسبت نہ شوقِ نام و نمود
 وہ عزمِ حوصلہ مند اور وہ نگاہ بلند
 وہ طبعِ فقر پسند و مزاجِ مستلزمِ جود
 مہرِ حبیبِ عقیدت کو چومنے والا
 مرا شفیق ، مرا مسترداں ، مرا مسعود

وہ ایک دائرِ امان تھا مرا بروئے زمیں
 وہ اک پہناہ تھی میری زیرِ چرخِ کبود
 میں اُس کی بزم میں آیا تو اٹھ گیا وہ بھی
 طلب نے ہاتھ بڑھایا تو کچھ نہ مہتا موجود
 شریکِ بزمِ وجود آج بھی ہوں میں لیکن
 نہیں ہوں اپنی خوشی سے شریکِ بزمِ وجود
 خدا و خلق سے جب تک ہے واسطے دست
 نہ خامشی کی اجازت نہ افرینِ گفت و شنود
 حفیظِ مرگِ احسا کے بعد زندہ ہوں
 یہ زندگی ہے کہ پابندیِ رسوم و قیود

اقبال

زندگی میں

اک تھکا ہارا مسافر ہوں اندھیری رات ہے
 کوئی شنگی ہے نہ ساتھی، بس خدا کی ذات ہے
 کارواں غولابن محمدانی کو "سبر" مان کر
 ہو چکا گمراہ، گمراہی کو منزل جان کر
 ہمراہوں کے اس چلن سے دامن دل چاک ہے
 آہ اس اتمام کا اغلام عبرت ناک ہے
 دیدہ ہائے غول کو سمجھے چراغِ اُمن کی ہزار
 توڑ کر عزمِ سفر، سب چھٹ گئے پروانہ وار

جانتا ہوں اس روش کی پیروی بے سود ہے
 اب مجھے تنہا تلاش منزل مقصود ہے
 پیچھے پیچھے شور و شیون کی صدا سُنتا ہوا
 آگے آگے جا رہا ہوں اپنا سر دھتتا ہوا
 دادی ظلمات ہے کوئی نہیں ہے رہنا
 اتر سے پیدا و پنہاں ہے ستاروں کی ضیا
 اک ستارا ان ستاروں میں ہر دم ساز ہے
 نور اس کا، میری اپنی روشنی کا راز ہے
 ایک سیلاب بقا ہے یا رواں ہے زندہ رود
 میری فطرت سن رہی ہے اس کا نورانی سرود
 اس کا دامن ضیا تو دسترس سے دور ہے
 دور کے جلوے سے ہاں میری نظر معمور ہے
 کیا یہی تابندگی پنہاں مرے سینے میں ہے؟
 یا اسی کا عکس میرے دل کے آئینے میں ہے؟

ناظرِ جلوہ ہے وہ میں طالبِ نظارہ ہوں
 عرش پر اس کی نظر، میں فرش پر آوارہ ہوں
 تاہم اک نسبت تو اس اختر کو میرے دل سے ہے
 واسطہ دونوں کا شاید ایک ہی منزل سے ہے
 ہے ازل کی اس غلط بخشی پہ حیرانی مجھے
 عشقِ لافانی ملا ہے، زندگی فانی مجھے
 جس طرف جاتا ہے وہ اُس سمت راہی میں بھی ہوں
 طالبِ نظارہ ہائے صبح گاہی میں بھی ہوں

یہ رہ تارِ یک، یہ محدودِ بینائی ہری
 یہ سفر، یہ رات کا عالم، یہ تنہائی ہری
 اُدھر گھر کر آ رہی ہیں کالی کالی بلیاں
 چھا گئی ہیں بجلیاں چمکانے والی بلیاں

ہوتی جاتی ہے فضا کچھ اور بھی تاریک و تاریک
 سنگ قدموں سے اُجھنے لگ گئے، دامن سے خار
 ہوتا جاتا ہے گھنا جنگل گھنیرا اور بھی
 بجلیاں چمکیں تو بڑھتا ہے اندھیرا اور بھی
 بخیرگی میسر ہی دلیل راہ بن سکتی نہیں
 بجلیاں تشیل حبلہ گاہ بن سکتی نہیں
 سُن رہا ہوں بھیڑیوں کی غرقشیں غراہٹیں
 آتی ہیں کانوں میں دل دہلانے والی آہٹیں
 چار سو غولوں کی آنکھیں آگ بھڑکاتی ہوئی
 ٹولیاں بھوتوں کی ہنستی بولتی گاتی ہوئی
 اور دیوانی ہوا بھی چھیختی چنگھٹاڑتی
 رقص کرتی، خاک اُڑاتی، گردِ دامن جھاڑتی
 پُر خطر ماحول ہے لیکن چلا جاتا ہوں میں
 وادی پر ہول ہے لیکن چلا جاتا ہوں میں

اس سفر میں چلتے جانے کے سوا چارہ نہیں
 تھک گیا ہوں میں، یقین میرا تھکا ہارا نہیں

رفتہ رفتہ سب ستارے بدلیوں نے چھاپ لیے
 نور پارے کالی کالی ڈاسنوں نے کھا لیے

ہاں فقط میرا ستارا آشکارا ہے ابھی
 اس زمیں پر آسمانی اک سہارا ہے ابھی
 تیز پاتا ایک عنبریتوں سے ٹکراتا ہوا

چل رہا ہے نور برساتا ہوا، گاتاتا ہوا
 ہر قدم پیغام ملتا ہے ستارے سے مجھے

سو تسلی مل رہی ہے اک اشارے سے مجھے
 کہ رہا ہے کیا ہوا گھٹی اگر تاریک ہے

صبح صادق مہنڈل مقصود بھی نزدیک ہے

تو اگر گرم سفر ہے، راستہ کٹ جائے گا
 آسمان سے ابرِ ظلمت بار بھی چھٹ جائے گا
 امتحاں رکھے گئے ہیں جن کی راہوں کے لیے
 جلوہ خود بے تاب ہے ان کی نگاہوں کے لیے
 اے مرے پیارے ستارے، میرے نورانی رفیق
 ذرّہ خاکی ہوں لیکن میں ہوں تیرا ہم طریق
 دیکھ، میری آنکھ سے اوجھل نہ ہو جانا کہیں
 اس ہجومِ ابر میں مجھ سے نہ کھو جانا کہیں
 تو اگر چاہے تو حاضرِ سینہ ہے تیرے لیے
 یہ میری آنکھیں نہیں ہیں زینہ ہے تیرے لیے
 میرے دل میں بیٹھ، مجھ کو سوتے منزل لے کے چل
 نا خدا ہے تو، یہ کشتی تا بہ ساحل لے کے چل
 تیرا درِ کس زندگی میرا شریکِ حال ہے
 اے مرے روشن ستارے تو ہمارا اقبال ہے

اقبال کی خبر مرگ

غم حوصلہ مند ہو گیا ہے دل صبر پسند ہو گیا ہے
 دریا دریا تھے میرے آنسو اب چشمہ ہی بند ہو گیا ہے
 جل جاتا ہے اشک سوزِ دل سے یہ قطرہ سپند ہو گیا ہے
 کیا لطف ہے ایسی زندگی کا ہر سانس گزند ہو گیا ہے
 اڑنے کا قفس سے ہر مہبانہ پرواز پر ند ہو گیا ہے
 گردن کے لیے یہ رشتہ عمر واللہ کمند ہو گیا ہے

عند کھانے کی چوکی ہے عادت

یہ زہر بھی قند ہو گیا ہے

اندازِ حیات و مرگ اقبال میرے لیے پسند ہو گیا ہے
 یہ کس کو خبر تھی وصل کا شوق پہلے سے دوچند ہو گیا ہے
 شاہینِ زمیں فلک پہ غورِ شید بھرتے ہی زقند ہو گیا ہے

اقبال بلند تھا ہمارا

اب اور بلند ہو گیا ہے

اقبال کے مزار پر

لحد میں سو رہی ہے آج بے شک مُشتِ خاک اُس کی
 مگر گرمِ عمل ہے جاگتی ہے جانِ پاک اُس کی
 وہ اک فانی بشرِ تہا، میں یہ باور کر نہیں سکتا
 بشرِ اقبال ہو جائے تو ہرگز مُر نہیں سکتا
 بزیرِ سایہ دیوارِ مسجد ہے جو آسودہ
 یہ خاکی جسم ہے سترِ برس کا راہِ پیمودہ

یہ خاکی جسم بھی اس کا بہت ہی بیش قیمت تھا
 جسے ہم جلوہ سمجھے تھے، وہ پردہ بھی غنیمت تھا
 اسے ہم ناپتے تھے لے کے آنکھوں ہی کا پیما نا
 غزل خواں اس کو جانا ہم نے شاعر اس کو گردانا
 فقط صورت ہی دیکھی اس کے معنی ہم نہیں سمجھے
 نہ دیکھا رنگ تصویر آنے کو دل نشیں سمجھے
 ہمیں ضعف بصارت سے کہاں تھی تابِ نظارا
 سکھائے اس کے پردے نے ہمیں آدابِ نظارا
 یہ نغمہ کیا ہے زیرِ پردہ ہائے ساز، کم سمجھے
 رہے سب گوش بر آواز لیکن راز کم سمجھے
 شکستِ سپیکر محسوس نے توڑا حجابِ آخر
 طلوعِ صبحِ عشرین کے چمکا آفتابِ آخر

مقید اب نہیں اقبال اپنے جسم فانی میں
 نہیں وہ بسندِ حائل آج دریا کی روانی میں
 وجودِ مرگ کی قائل نہیں تھی زندگی اس کی
 تعالیٰ اللہ اب دیکھے کوئی پائندگی اُس کی
 جسے ہم مُردہ سمجھے زندہ تر، پائندہ تر نکلا
 مد و خورشید سے ذرے کا دل تابندہ تر نکلا
 ابھی اندازہ ہو سکتا نہیں اس کی بلندی کا
 ابھی دُنیا کی آنکھوں پر ہے پردہِ فرقہ بندی کا
 مگر میری نگاہوں میں ہیں چہرے ان جوانوں کے
 جنہیں اقبال نے بخشے ہیں بازو و قہمانوں کے

ہم سفر

جب توتے ہم سفر سے درگزر ذوقِ سفر
اب تو حبِ گنہ بھی نظر آنے لگے تابندہ تر

کر مکِ شب تابِ مہر و ماہ بن سکتے نہیں
یہ مُسامرہ کے رُسیقِ راہ بن سکتے نہیں

روشنی ان کی انہی کی ذات تک محدود ہے
اتنے دُنبالوں کے پیچھے دوڑنا بے سود ہے

راہِ خود بن جائے گی نورِ آفریں میرے لئے
مکتفی ہے لَا اِحْبَبُّ اِلَّا فِیْلِیْ میرے لئے

تلخا بڑ شیریں

تعمیر و تخریب

بہشت اور دوزخ کی راہوں سے گزرے
یہ دونوں ہم ساری نگاہوں سے گزرے

بنجارہ پرست : (حیدر آباد دکن) : انسان کے حُسن کار
لامنوں کے تمیز کیے ہوئے ایک فردوں پرست
زین کی یاد میں -

ایک مہذب بشر : بیچ میں آغازِ فساد کی ایک شام

بنجارہ پرست

دو جانب تا حدِ نظر، پھیلے ہوئے بن کے نظارے
 کرہ و دمن کے سنگ و شجر کے دشت و چمن کے نظارے
 اور دو جانب حور و قصور و حسد و عدل کے نظارے
 یہ بنجارہ پرست، یہ فردوس دکن کے نظارے
 جنت میں بھی کون کرے گا ان سے زیادہ شاد مجھے
 جنت میں کب ٹپکنے دے گی اس دنیا کی یاد مجھے

میں نے اس ویرانے کو بستی میں بدلتے دیکھا ہے
 پتھر حُسنِ صورت کے سانچے میں ڈھلتے دیکھا ہے
 رنگ رنگ کی صنعت کا نیرنگ اُچھلتے دیکھا ہے
 سنگ سنگ پر شاخ و شجر کو پھولتے پھلتے دیکھا ہے
 اب تک ہے یہ دید کی دُنیا عیدِ مبارک کا دمجھے
 جنت میں کب ٹکنے دے گی اس دُنیا کی یاد مجھے
 پرست کی دیوارِ اُچھٹانیں بُنیادیں تعمیرِ دلی کی
 قدرتِ جُرات دیکھ رہی ہے انسانی تدبیرِ دلی کی
 صنعتِ منہ سے بول رہی ہے حاجت کیا تقریروں کی
 خاموشی سے دیکھتے جاؤ دُنیا ہے تصویرِ دلی کی
 یہ مزدورِ نظر آتے ہیں ماتی اور ہیرا دمجھے
 جنت میں کب ٹکنے دے گی اس دُنیا کی یاد مجھے

یاد مجھے تڑپائے گی ان باہمت انسانوں کی
 جن کے حُسنِ عمل سے بدلی ماہیت ویرانوں کی
 جن کے قدم کی ٹھوکر سے جاگی تقدیر چٹانوں کی
 جن کے ہاتھوں پتھر ٹوٹے شکل بنی ایرانوں کی
 ان کی نڈرت کاری پر دینا ہے خراجِ داد مجھے

جنت میں کب ٹکنے دے گی اس دنیا کی یاد مجھے

کوہکن دشیریں کا قصہ ، ناکامی کا افسانہ
 معمولی سی نہر کی خاطر یوں سر بھوڑ کے مرجانا
 دوسروں کا منظورِ نظر فرہادِ جاہل دیوانہ
 اور ہر موضوعِ سخن اک — عالی ہمت فرزادہ

میں ہوں مجنوںِ جدی کا ، مطلوب نہیں فرہاد مجھے

جنت میں کب ٹکنے دے گی اس دنیا کی یاد مجھے

صبح کمندیں بھپکتی ہے جب بستی و بلند ہستی پر
 پہلی کرنیں سورج کی لہراتی ہیں اس بستی پر
 اس بستی کے حُسن کا پر تو پڑتا ہے ہر بستی پر
 لاکھوں مندر کھل جاتے ہیں چشمِ حُسن پر بستی پر
 سجدوں پر اُکاتی ہے ہر صبح نئی اُفتاد مجھے
 جنت میں کب بٹکنے دے گی اس دُنیا کی یاد مجھے

اس دُنیا میں ذوقِ نغمہ پر وا ہے درِ آزادی کا
 آزادی سے کرتا ہوں نغمہ را اس آبادی کا
 پس منظر کُسا برِ مسلسل، سامنے منظرِ وادی کا
 شاید بارغِ خاص یہی ہے فطرت کی شہزادی کا
 جس میں نظر آتا ہے نہ گلچیں اور نہ کوئی صیاد مجھے
 جنت میں کب بٹکنے دے گی اس دُنیا کی یاد مجھے

مست ہوائیں پھولوں پر شبنم کے موتی رولتی ہیں
 شاخوں کے آغوش میں ننھی کلیاں آنکھیں کھولتی ہیں
 ببل گل پر سنڈ لاتی ہے، پیڑ پر چڑیاں بولتی ہیں
 میرے دل میں توبہ کی کمزور سنائیں ڈولتی ہیں
 یاد آتے ہیں گشتِ مصلے، آبِ رُکنا بادِ مجھے
 جنت میں کب ٹپکنے دے گی اس دُنیا کی یاد مجھے

زیرِ چرخِ نیلی ساگر گرے نیلے پانی کا
 آنکھیں ہیں اور لطفِ تماشا لہروں کی جولانی کا
 پہلی سی وہ کشتیِ دل ہے اور نہ جوشِ جہانی کا
 موجِ ہوائے سیر میں لیکن عالم ہے طغیانی کا
 فغموں کا اک طوفاں ہے آہنگِ آب و بادِ مجھے
 جنت میں کب ٹپکنے دے گی اس دُنیا کی یاد مجھے

کر نہیں دن بھر اس ساگر پر نور کا مینہ برساتی ہیں
 اور ہوائیں آبِ رواں پر نقشِ نگار برساتی ہیں
 موجیں سوج زنی کرتی ہیں اور لہریں لہراتی ہیں
 نقرتی پریاں کھینچتی ہیں لڑتی ہیں پھر مل جاتی ہیں
 خالمِ فتنے مارتی ہیں کہ کہہ کر آدم زاد مجھے
 جنت میں کب ٹہکنے دے گی اس دنیا کی یاد مجھے
 مغرب میں ہر شام یہاں ساتی کا درحیپ کھلتا ہے
 رنگِ شفق سیلاب کی صورتِ بامِ فلک سے ڈھلتا ہے
 نیل کے ہر ساگر میں یا قوت کا جوہر کھلتا ہے
 کس کو خبر یہ خوں تابہ کس شے سے ملتا جلتا ہے
 باتے ہی شے ہے ہی شے ہے جس نے کیا برباد مجھے
 جنت میں کب ٹہکنے دے گی اس دنیا کی یاد مجھے

دن کا مسافر کرتا ہے جب منکر آسودہ ہونے کی
 پہچم میں ہوتی ہے نمائش اک رنگین بچھونے کی
 سورج دیوتا ٹھانتے ہیں زرین محل میں سونے کی
 سوجھتی ہے دہقانِ فلک کو کھیت میں موتی بونے کی

محو حیرت کرتا ہے یہ مالِ لائقِ ادا مجھے

جنت میں کب ٹکنے دے گی اس دُنیا کی یاد مجھے

جس دم غنید کی ماتی دُنیا بستر پر جا سوتی ہے

مقمقہ ہائے برق سے برپا بزمِ چراغاں ہوتی ہے

پریم کی دیوی جل مندر میں چندر مار پر ورتی ہے

پریم کی آنکھیں جل مندر ہیں پریم کا آئسو موتی ہے

ہر موتی کی جوت پہ دیوی کہتی ہے دھنبا دمجھے

جنت میں کب ٹکنے دے گی اس دُنیا کی یاد مجھے

پنپٹھ میں جیسے پنج بج رہا سب بجا رہے کرتے ہیں
 بات بات میں گھات، مگر سنسن سنسن کے اشارے کرتے ہیں
 ایسی ہی کچھ جہلہ فروشی چاند ستارے کرتے ہیں
 رات رات میں لاکھوں ہی کے وارے نیارے کرتے ہیں
 کیا کیا سیر دکھاتی ہے یہ دُنیا ئے شب زاد مجھے

جنت میں کب ٹکنے دے گی اس دُنیا کی یاد مجھے

ہاں یہ میرے شام و سحر ہیں، یہ دن ہیں یہ راتیں ہیں
 میں ہوں اور مری آنکھوں کی عیدیں ہیں، شہر ایتیں ہیں
 چاند ہے، سورج ہے، ساگر ہے، بادل ہے، برساتیں ہیں
 تنہائی ہے، خاموشی ہے، دل کی دل سے باتیں ہیں

ماہل ہے اس دُنیا میں تخیلِ سخنِ احباب مجھے

جنت میں کب ٹکنے دے گی اس دُنیا کی یاد مجھے

ایک مُنڈب شہر

(شامِ شیفاد)

اک مُنڈب شہر رونق پر ہے، قُربِ شام ہے
کوچہ و بازار میں انبوہِ خاص و عام ہے

ہر درندہ ان میں خُونِ آشام ہے

شاہراہوں پر ہے رفتارِ ترقی تیز تیز

ہر قدم ہے ولولہ انگیز اور ہنگامہ خیز

بھیڑیے ہونے کو ہیں گرم ستیز

ہمراہِ برق و آہن تیرگی تابشِ دگر

موتِ دوڑی جا رہی ہے یا بشر کی زندگی

زیر و بالا آلہٴ درندگی

شہرِ زہرِ آلودہ ہے لیکن یہ ہوتا ہے کہاں

بہرہی ہیں چار جانب رنگِ بو کی ندیاں

مذبحوں میں خُونِ ہو جیسے رواں

ہر دکال شیشے میں تہذیب و تمدن کی پُری
 مشترک تصویرِ خوش اندامی و خوش منظری
 ہر کوئی ہے درپے غارت گری
 طرے، دستاریں، کُلاہیں با وقار و وضعدار
 مشرق و مغرب برابر ہم عنان و ہم کنار
 شامیت اعمال ہر سر پر سوار
 ساڑھیوں بُرقعوں دوپٹوں کی ادائیں رنگ ننگ
 سادہ و پرکار نسوانی قبا میں تنگ تنگ
 لائے لٹنے کو ہے یہ ناموس و ننگ
 اختلافِ نسل و طبقات خوش رنگی کے ساتھ
 مختلف نغمے اٹھیں جیسے ہم آہنگی کے ساتھ
 پھٹ پڑے گا نعرۂ جنگی کے ساتھ
 عید یا تیار یا تقریبِ شادی ہے کہیں
 شاد ہیں کچھ اس طرح شہرِ مہذب کے مکین
 ہے کمینہ پن مگر اُنذر کمین

تقدیر کشمیر

کیا واقعی اب خون کے چراغ بغیر اس
بہشت کی دید ممکن نہیں؟

کشمیر ہے وہ جلوہ مگر اُس کی راہ میں
فُوت کی وادیاں ہیں پہاڑ انتظار کے

حَظِظ

تصویر کشمیر

معرکہ درپیش ہے جذبات کی تفسیر کا
 ہو رہا ہے تذکرہ کشمیر میں کشمیر کا
 کھینچنا تصویر کا لانا ہے جوئے شیر کا
 رنگ بھر دے اے قلم الفاظ میں تاثیر کا
 لطف ہے کہ اٹھے ہر نقش اس تحریر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

چار سو پہرے کھڑے ہیں ساکت صبا مچلتی
 تاج نوران کے سروں پر جسم ان کے سبز پوش
 ایک ہی قانون قدرت کے ہیں یہ حلقہ بگوش
 کچھ نہیں جُز خدمت کشمیر کساروں کو ہوش
 روکتے ہیں راستہ ہر دشمن بے پیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا
 برف کی اونچائیاں برفاب کی گہرائیاں
 ڈگ بُو کی شوخیاں، پھولوں کی بے پروائیاں
 سبز قالینوں پہ دیوداروں کی بزم آرائیاں
 بنتے بنتے چلتے پھرتے ابر کی پرچائیاں
 آگے پیچھے دوڑنا تاریکی و تنویر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

برف کے دیو زاد تو دے نور کے آئینہ دار
 نقرئی جھیلوں میں صبح و شام عکسِ زرد نگار
 نعمہ خواں جوشاں خروشاں آبشار و جوبار
 خندہ قدرت گل اندر گل بہار اندر بہار
 کیوں شگفتہ ہونہ دل اک شاعرِ دلگیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا
 ندیاں ہر سو تھرکتی ناچستی گاتی ہوئی
 کسماتی لڑکھڑاتی تیج بل کھاتی ہوئی
 آدمی کیا پتھروں کو وجد میں لاتی ہوئی
 اپنی اپنی منزل مقصود کو جاتی ہوئی
 کرتی جاتی ہیں نگاہوں پر عملِ تسخیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

تابہ دامانِ نظر چلیوں کے دیو داروں کے بن
 سینہ ہر سنگِ خارا سے رواں نہ لبِ لب
 بُوالعوس کے واسطے لیکن یہ رستے ہیں کٹھن
 مرگیا سر بھوڑ کر ان پتھروں سے کو بہن
 سُن لیا تھا نام بے چارے نے حُجّے شیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا
 دامنِ مرگ سے قائم ہے فطرت کا سہاگ
 حُسن کی مورت امر ناتھ آئینہ ہے شیش ناگ
 ہائے چشموں کی روانی ہائے چہرہ اہوں کے راگ
 اک مری آنکھوں کی ٹھنڈک اک مے سینے کی آگ
 نقشِ حیرت ہوں مجھے یارا نہیں تقریر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

دل ربا دوشیزگی ہے چہرہ لولاب پر
 حُسنِ سادہ ہنس رہا ہے عالم اسباب پر
 کوثر و تسنیم غش ہیں اس ردائے آب پر
 رشک ہے فردوس کو اس سبز شاداب پر
 آب میں مئے کا اثر ہے خاک میں اکیکل
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا
 عام شاعر کہ گئے کشمیر کو جنتِ نشان
 ورنہ جنت میں یہ حُسن و رنگ و شادابی کہاں
 کیا ہے جنت چند حُوریں اک چین و ندیاں
 خیر ز اہد کی رعایت سے یہ کتا ہوں کہ ہاں
 عالم بالا پہ ہے پر تو اسی کشمیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

خوبصورت کھیت بھی، گلزار بھی، کُसार بھی
 خوبصورت پھول بھی، شجر بھی، اٹار بھی
 خوبصورت ہر بشر مفلس بھی اور زردار بھی
 ظاہر کشمیر رنگیں بھی ہے اور پُرکار بھی
 باطن کشمیر لیکن سیٹ ہے انجیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا
 حُسن کی مندرِ اطِ خوبی کی فراوانی یہاں
 ہے نظر کو اعترافِ تنگ دامنِ یہاں
 بہرِ جان و جسم ہر نعمت کی ارزانی یہاں
 بے کس و محتاج لیکن نوری انسانی یہاں
 نقشِ فریادی ہے یہ تقدیر کی تحریر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

دادی و کُتسار پر ایسی ہسار آتی ہوئی
 نخل آدم زاد پر لیسکن خزاں چھائی ہوئی
 اس قدر خوش رنگ کلیاں اور مڑھائی ہوئی
 راکھ میں چکاریاں جلیے ہوئے کھلائی ہوئی
 حسرت آلود ہے چہرہ ہر جوان و پیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا
 اک طرف مہمان خوش اوقات خوش دل خوش لباس
 اک طرف ہے میزباں افاقہ زدہ تصویر یاس
 اک طرف مئے کا نشہ بھل کا مزہ، پھولوں کی باس
 اک طرف بے کیف مزدوری کا حاصل بھوک پیاس
 اک تماشائی ہے اک فرزند ہے کشمیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ہائے جہلم کے یہ بجرے ہائے یہ آنچل کی اوٹ
 چادر آب رواں دونوں طرف رنگین گوٹ
 ہائے ہانچی کا یہ گنبد جس کا سرمایہ ہے بوٹ
 یہ شقت یہ فلاکت لب پر نغمہ، دل پر چوٹ
 شیر سے محروم ہے مالک ہے جوئے شیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا
 سطح ڈل لڑناں، کنول رقصاں، شکائے ہیں رواں
 ان کے اندر کچھ حسیں بھی پیارے پیارے ہیں رواں
 لیٹے لیٹے خواب راحت کے سہارے ہیں رواں
 آسمانِ حُسن پر گویا ستارے ہیں رواں
 زہیم باز آنکھیں مگر ہر سو نشانہ زہیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

کشتیوں کی استراحت اور باغوں کی بہار
 دن چاروں کی فضا میں شبِ حلقوں کی بہار
 ہے یہ زرداروں کی اور اُنچے دماغوں کی بہار
 ان کے چاکر دیکھتے ہیں دل کے داغوں کی بہار
 ہے دھواں چڑھے گا ان کو مشغلہ کفگیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا
 جس کی محنت سے چمن میں رُوئے گل پر خندہ ہے
 اس کا گھر تار یک اس کا اپنا منظر گندہ ہے
 نقشِ صنّاعی کا جس کی لوحِ دل پر کندہ ہے
 اس کی مجبوری کو دیکھو بندگی کا بندہ ہے
 سانس لینے میں بھی اس کو خوف ہے تعزیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

مجمع اضداد ہیں دیہات بھی اور شہر بھی
 موت بھی طاری ہے ان پر زندگی کی لہر بھی
 اس زمیں پر آسماں کا لطف بھی ہے قہر بھی
 اپنے بچوں کے لیے یہ شہد بھی ہے زہر بھی
 آب و گل کا یہ عجب ہے عجب تجھیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا
 یہ چمن اغیار کی سلسلہ حرامی کے لیے
 یہ ثمر شیریں ہیں اپنی تلخ کامی کے لیے
 زندگانی ہے یہاں مرگ و وامی کے لیے
 مائیں جنتی ہیں یہاں بچے غلامی کے لیے
 ہر نفس اک سلسلہ ہے قید بے زنجیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

حاکم و محکوم میں تیغ و گلو کا استیاز
 اور دونو پائے مغرب پر ہیں مجبور نیاز
 یہ بہمن کے بھجن یہ شیخ صاحب کی ف ساز
 کر رہے ہیں قیدِ ناعسوس کی رستی دراز
 ہے نگاہوں سے نہاں صیاد اس نچر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا
 خیر ہم کو کیا عنرض اس قدم کے حالات سے
 بدگماں ہوتی ہے وںیا اک ذرا اسی بات سے
 ہم تو لطف اندوز ہونے آئے ہیں باغات سے
 ہم کو دلچسپی نہیں ہے مالیوں کی ذات سے
 نطف کیوں کھوئیں ہم اپنی چشم لذت گیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

چشمہ شاہی پہ آؤ لے کے اک بوتل چلیں
 شہر کے جھگڑوں سے گاندھری کی جانب بل چلیں
 آؤ ویری ناگ دیکھیں آؤ اچھپا بل چلیں
 ہستی مزدور کو پیروں کے نیچے بل چلیں
 اس کی یہ مسکین صورتِ دام ہے تزویر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

یہ غریب و مفلس و مجبور ہیں ہم کیا کریں !
 کم سخن، کمزور دل مزدور ہیں ہم کیا کریں !
 حسن و صنعت کے لیے مشہور ہیں ہم کیا کریں !
 ان کے گھر افلاس سے معمور ہیں ہم کیا کریں !
 ان کی صورت ہے نوشتہ کاتبِ تقدیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

دیکھ کر باشندہ کشمیر کو اندوہ لگیں
 ہنستے ہیں اہل تماشا کوئی ہمدردی نہیں
 غیر ملکی زائروں کو ہو گیا ہے یہ یقین
 جنتی ہے مزدور ہی اس باغِ حنبت کی زمیں
 یہ نتیجہ ہے کسی ناگفتنی تقصیر کا

ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا
 زائروں کا موسم گرما میں رہتا ہے ہجوم
 اہل دل کم، بیشتر ان میں نظر آتے ہیں شوم
 مختصر مزدوری ارزاں پہ ہیں ان کے قدم
 ہیں تو یہ جگنو مگر خود کو سمجھتے ہیں سنجوم
 یہ زمیں گروشہ ہے ان کی خانگی جاگیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ان کے دم سے رونقِ گلرگِ شانِ بہنگام
لیکن ان دونوں میں ہے بد ذوقیوں کا اڑہام
رات دن آلودہ کرتا ہے انہیں انبوہِ عام
حسنِ فطرت کا نہیں ان کے دلوں میں احترام

کام ہے تفریح سے جذبہ نہیں توقیر کا

ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اس گروہِ عام کا ہے ذوقِ کتنا بے بساط

یا شکم کی پرورش یا مرد و زن کا اختلاط

آدھ کاؤں میں تجھے راہِ حصولِ انبساط

”شام در باغ نسیم و صبح در باغ نشاط“

دیدہ و دل کے لیے سامان ہے تطہیر کا

ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اس سے بڑھ کر اُور کچھ پرا ہے تو شالامار دیکھ
 آنکھ رکھتا ہے تو یہ رنگِ گل و گلزار دیکھ
 کچھ نہیں دیکھا ابھی، پھر دیکھ پھر اک بار دیکھ
 شانِ معلیٰ کے یہ میٹھے ہوئے آثار دیکھ

تو نے دیکھا ہے کہیں ایسا بھی فنِ تعمیر کا

ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

کیا تجھے معلوم ہے یہ نہر کیوں ہے بے قرار

سر پٹکتے ہیں زمیں پر کس لیے یہ آبشار

سرو کیوں ہیں پابِ رگل اور دم بخود ہیں کیوں چنار

نہر ٹھکائے کیوں کھڑے ہیں لٹخل ہائے باردار

سبزہ کیوں منہ تک رہا ہے آسمانِ پیر کا؟

ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

کون جانے کس لیے رنگین چکل روتے ہیں غوں
 اس حبس بارہ درمی پر سوگ سا طاری ہے کیوں
 محو عبرت کیوں کھڑے ہیں سنگِ موسیٰ کے ستوں
 کیوں شکستہ قلبِ فواروں کو ہے جوشِ جنوں
 منتظر ہے باغِ کس کے خواب کی تعبیر کا؟

ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا
 چشمِ شاعر کے ہیں آنسو ان کو مٹی میں نہ رول
 بے خبر انمول چہرہ کو ترازو سے نہ تول
 ایک گوشے میں ادب سے بیٹھ جائے نہ سے نہ بول
 اوتاماشانی! تصورِ شرط ہے آنکھیں نہ کھول

چشمِ دل سے دیکھ نقشہِ گردشِ تقدیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

عامیوں سے کوئی کہے بند کر دیں کھیل کود
 باغ کو خالی کرے اہل نمائش کا وجود
 ہو گئی ہے رات سو جائے کہیں بزم نمود
 ہونے والا ہے یہاں اب پاک رُوحوں کا ورود
 پیش خمیہ آگیا اک بزم خلوت گیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اک سُہانی چاندنی رات اور شا لاما ر باغ
 دیکھ روشن ہو گیا ہر ایک لالے کا چہرہ باغ
 خود بخود پڑ کر لیے رنگین پھولوں نے ایاغ
 عرش پر جانے لگا پا مال سبزے کا دماغ
 رنگ و بو کو بھی سہارا مل گیا تشہیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

مطرب آئے نے نواز آئے مزہ سیر آگئے
 نعمت خاموش کی بن بن کے تصویر آگئے
 دفعہ بیرون در کچھ اہل شمشیر آگئے
 اندرون در شہنشاہ جہانگیر آگئے
 ساتھ اک پُر نور حلقہ عدل کی زنجیر کا
 ایک پہلو یہ بھی کشتی سیر کی تصویر کا
 باغ کا در پھر کھلا باد باری آگئی
 اک ردائے سبز، بہر پردہ واری آگئی
 صد نقاب اوڑھے ہوئے پر ہیز گاری آگئی
 لیجئے نور جہاں کی بھی سواری آگئی
 گرد جھڑٹ عقل کا تہذیب کا تدبیر کا
 ایک پہلو یہ بھی کشتی سیر کی تصویر کا

غنچہ و گل میں مثال بُہ ہوئے دونوں مہاں
 باغ میں داخل ہوا شاہ جہاں صاحبِ قراں
 سخت گیر و داد گسترِ قسمان و مہرباں
 ہر کابِ اقبال شاہی شان و شوکت ہم عناں
 میرِ ساماں ساتھ اور سامان بھی تعمیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا
 محوِ سیرِ باغ ہے یہ مرکزِ توقیر بھی
 اب چمن میں گونج اٹھا اک نعرہٴ تجسیر بھی
 غل ہوا وہ آئے شاہنشاہِ عالمگیر بھی
 فقر کے قبضے میں تخت و سبخت بھی تسخیر بھی
 سامنے قرآن قبضہ ہاتھ میں شمشیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ہے عجب وُضدِلی ضیا اُجلا اندھیرا باغ میں
 ہر چمن کو نور پوشوں نے ہے گھیرا باغ میں
 ہے شناسا اب کوئی تیرا نہ میرا باغ میں
 بانیانِ باغ کا اُترا ہے ڈیرا باغ میں
 خوف ہے تعزیر کا ان کو نہ دار و گیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا
 تُو نے دیکھا اے تصور کیا ہے اب پھولوں کا رنگ
 آبشاروں کا یہ غنم، نہر کا یہ حب و تنگ
 ڈل کے اندر نفرتی لہروں کی پریاں محبوبِ جنگ
 چاند تاروں کو زمیں پر لوٹ جانے کی اُمنگ
 بے خودی طاری ہے عالم ہے عجب تاثیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

چاند ڈل میں ڈوبنے کو ہے سحر ہونے کو ہے
 روز کا ہنگامہ پھر پیش نظر ہونے کو ہے
 ہائے منتظر بھی اب زیر و زبر ہونے کو ہے
 سونے بالا پاک رُوحوں کا سفر ہونے کو ہے

ہم نشیں عالم ہے یہ اک نالہ شبگیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

باغ کے در پر لبسِ راتیں کیا کرتا ہوں میں
 نذر خاموشی مناجاتیں کیا کرتا ہوں میں
 ماضی کشمیر سے باتیں کیا کرتا ہوں میں
 بادشاہوں سے ملاقاتیں کیا کرتا ہوں میں

پوچھتا رہتا ہوں مقصد ان سے اس تعمیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ہنس کے فرماتے ہیں وہ اے شاعر نکلیں باں
 تُو نے دیکھے شوکت انسان فانی کے نشاں
 دیکھنے والا اگر ہو زندگی کا راز داں
 وہ بھی کر سکتا ہے یونہی حُسنِ فطرت کو عیاں
 ہے یہ اک ادنیٰ نمونہ قوت و تدبیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا
 دیکھنے والے مگر اس بات کو سمجھے نہیں
 حوصلے والوں کی نفسیات کو سمجھے نہیں
 ان سبق آموز تعمیرات کو سمجھے نہیں
 اور کیا سمجھیں گے اپنی ذات کو سمجھے نہیں
 توڑ کر سمیت کھلونا بن گئے تقدیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

زندگانی چارہ دن کی زندگانی ہی سہی
 شرکتِ مخلت اب قصہ کہانی ہی سہی
 اک سبق دیتی ہیں تعمیریں پُرانی ہی سہی
 نقش باقی ہے ہمارا نقش فانی ہی سہی
 راز تو کھلتا ہے اس عالمِ تنخیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا
 کیا مجال دم زدن شاہوں کے ارشادات پر
 شاہِ عادل ہے تاریخ اُن کے احسانات پر
 جو نظر تھی قہر و ایوانات پر باعنات پر
 کاش وہ مرکوز ہوتی آدمی کی ذات پر
 پھر سجا ہوتا گلہ کوتاہی تدبیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

نسل انسانی کو ٹھہرا یا گیا بے کار و زشت
 رائیگاں ہوتی رہی دھت ان کی زرخیز کشت
 رنگ و نغمہ سا غر و مل سبزہ و گل سنگ و خشت
 خواب کے عالم کو اہل قدرت سمجھے بہشت
 خواب دیکھا منہ نہ دیکھا خواب کی تعبیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا
 اک جہاں کشمیریوں کے حال پر ہفتا ہے آج
 نام ہے ان کا فیری جیلہ گر و بہ مزاج
 بے دلی، بے استقامتی، مفلسی اور آحتیاج
 بندگی صد ہا برس کی اور مسلسل سامراج
 کس قدر ساماں فراہم ہے یہاں تحقیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اہلِ حشمت کی یہ قبریں یہ شکستہ کاخ و کو
 زنگ خوردہ اسلحہ، ٹوٹے ہوئے جام و سُبُو
 ٹھیاں مزدور کی ہیں اور کسانوں کا لہو
 جس کھنڈر کو دیکھ کر اے دوست افسردہ ہے تو

یہ خرابہ ہے خدا کی بہترین تعبیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

عشرتِ ماضی کی ہے خمیازہ کش دُنیا نے حال
 عیشِ چند انسِ راد کا لایا جماعت پر وبال
 ہائے یہ مغموم مائیں زلیست کے غم سے نڈھال
 ہائے یہ مدقوق بچے، ہائے روٹی کا سوال

ہائے کترا کر نکلتا ان سے بہرِ رگبیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ہم وطن ہی جب نہ اپنے ہم وطن کے کام آتے
 سر پہ ہمسائے کے ہمسایہ ہی جب طوفان اٹھاتے
 کیا بنا سکتی ہے پھر اے دوست تیری ٹائے ٹائے
 یہ منظر دکھتیا جا اور نہ کر اظہارِ رائے
 ورنہ قمری ایک دن لگ جاتے گا تکفیر کا
 ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

خون کے چراغ

(شہیدانِ آزادی کے مزاروں کی پکار)

سُرخ بھولوں سے زمیں کشمیر کی ہے سُرخ رُو
 لالہ بن کر بھوسٹ نکلا ہے شہیدوں کا لہو
 چھوٹے چھوٹے ڈھیر مٹی کے قطار اندر قطار
 راہِ آزادی میں لڑنے مرنے والوں کے مزار
 معرکہ اس خاک پر گزرا ہے دار و گیر کا
 لالہ زار اس کو نہ سمجھو، کھیت ہے شمشیر کا

یہ ہماری جاودانی زندگانی کے نشان
 چاند تاروں کی طرح روشن ہیں زیرِ آسمان

خوشنما چند ول اُڑتے اور لہراتے ہوئے
 چھماتے آسمانی راگنی گاتے ہوئے
 کوئی یہ منغے شہیدوں کے سوا سنتا نہیں
 جنگِ آزادی میں ایسے محو ہیں اہلِ زمیں
 اک طرف بھوکِ رعایا، اک طرف جاگیردار
 اک طرف دہشتان، اک جانب سپاہِ شہسار
 بکیوں کی آہیں ہنظلہموں کی چچنیں دردناک
 شورِ محشر ہے کہ ہم بھی سن رہے ہیں زیرِ خاک
 حملہ آور ہیں ہستوں پر مسلح جنگِ بخو
 آبِ جہلم کی رگیں ہیں اور کشمیری لہو
 یہ لہو جتنا ہے گا رنگ لاتا جائے گا
 راہِ آزادی میں تازہ گل کھلاتا جائے گا
 تاجکے آتش سے کھیلے گی کراتے کی یہ فوج
 قلمزمِ جمہور میں جاگی ہے آزادی کی موج

فطرتِ انساں کو ہے طوقِ اسلامی ناپسند
 حریت اٹھی ہے لے کر چسپم عزمِ بلند
 اٹھے ہیں مزدور جانبازی و کھانے کے لیے
 لعنتِ سرمایہ داری کو مٹانے کے لیے
 ان کے چہرے ہیں مرقعے جوش و خروش
 توڑ ڈالیں گے یہ سب آئینِ ظلم و جبر کے
 حُسنِ نصبِ العین ہو جن کی نگاہوں پر نثار
 ہم شہیدوں کی نگاہیں اُن کی راہوں پر نثار

اے رفیقو! سرفروشو! سننے جاؤ ایک بات
 ہم بھی زندہ تھے کبھی، ہم کو بھی پیاری تھی حیات
 دیکھتے تھے ہم بھی صبح و شام کی رنگینیاں
 ان نگاہوں نے بھی کی ہیں حُسن کی محلِ چنیاں

ہم بھی ان سینوں میں دل رکھتے تھے دل میں درد بھی
 گرم آنسو آنکھ میں، ہونٹوں پہ آہ سرد بھی
 دل دھڑکتا تھا ہمارا بھی نگاہ ناز پر
 رقص ہم بھی کر چکے ہیں زندگی کے ساز پر
 ہم نگاہِ حُسن کے طالب بھی تھے مطلوب بھی
 عشقِ نسیم بھی کیا تھا، ہم بنے محبوب بھی
 ہم تمھاری ہی طرح گودے تھے اس طوفان میں
 جان کی بازی لگا دی نسیم اس میدان میں
 تھے غلامی سے تمھاری ہی طرح بیزار ہم
 جنگِ آزادی کے تھے پہلے علم بردار ہم
 تھا پر پرواز اپنا بھی کبھی افلاک پر
 آج ہم قبروں میں ہیں، سوتے ہیں فرشِ خاک پر
 جسم ہیں سوتے ہوئے جانیں مگر بیدار ہیں
 اشتراکِ اہلِ مہمت کے لیے تیار ہیں

معرکہ آراؤ، ماں آگے بڑھو، بڑھتے چلو
 غاصبوں پر شند شیروں کی طرح چڑھتے چلو
 اب تمہارے ہاتھ اس آغاز کا انجام ہے
 ہم یہاں کام آگئے، آگے تمہارا کام ہے
 زور و زبر سے مکر و حیلہ سے نہ شور و شین سے
 مہوج آزادی نہ کترائے گی نصیب العین سے

منہ اگر آزادی کشمیر سے موڑو گے تم
 ہم شہیدوں، ہم وفاداروں کے دل توڑو گے تم

لالہ زویہ ترتیبیں یہ سینہ ہائے داغ داغ
 ہم نے اپنے خون سے روشن کیے ہیں یہ چراغ
 سرفروشو! ان چراغوں سے ضیا لیتے ہوئے
 آگے اور آگے بڑھو نام حسدا لیتے ہوئے

لبیک

مدینہ کی راہ میں

راہ پر آ ہی گئی گردشِ ایامِ آخر
ہو گیا رُوئے سفر سُوئے مدینہ میرا
مُعجزہ جس نے نہ دیکھا ہو وہ مجھ کو دیکھے
کس طرح ڈوب کے اُبھرا ہے سفینہ میرا
اپنے در پر جو بلاتے ہیں تو اتنا بھی کریں
اب کہیں اور نہ مرنا ہو نہ جینا میرا

عرفاتِ محو میں

اے مے آقا، مبرا از خطا تو ہے کہ میں؟
بخش دینا کام کس کا ہے خدا تو ہے کہ میں؟
منزلِ مقصد نہیں ملتی، تو اب میں کیا کروں
راہ تیری ہے کہ میری سینا تو ہے کہ میں؟
دل کی یہ افتاد میں کب تک لئے پھرتا رہوں
درِ تیرا ہے کہ میرا ہے 'دوا تو ہے کہ میں؟

عُذْر

میری آنکھوں کو نورِ بے نہ بے
 میرے دل کو سرورِ بے نہ بے
 مگر اتنا عذر ضرور بے
 کہ مجھے میری لوحِ حبیبیں نہ کہیں

مجھے دامنِ وفا میں پھنسا کے رکھو
 تہ دامنِ لطف چھپا کے رکھو
 میرے عشق کی ہو نہ کسی کو خبر
 مجھے دیکھ لے کوئی جس میں نہ کہیں

عجز

ہوا کو دیکھنا حُدا
 محل نہیں عندِ ور کا
 تُو ساتھ ساتھ ہے تو کیا
 حُدا بھی ساتھ ساتھ ہے

اُٹھا ہے دُھوم دھام سے
 جنازہ میرے عشق کا
 حسین بھی ساتھ ساتھ ہیں
 وفا بھی ساتھ ساتھ ہے